ایجاد و ابداعِ عالم

سے

عالمی نظامِ خلافت

تک

تنزل اور ارتقاء کے مراحل

تحریر:

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون:3-35869501
www.tanzeem.org

تقدیم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تحریر کردہ زیرِ نظر مضمون فلسفہ و حکمت کے نہایت دقیق اور اعلیٰ ترین مباحث پر مشتمل ہے۔

''حقیقت انسان'' کے عنوان سے ایک نہایت قیمتی تحریر آج سے قریباً پندرہ برس قبل محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلی تھی جواب ''زندگی، موت اور انسان'' نامی کتابچے میں شامل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ جس سے درحقیقت نہایت دقیق علمی مباحث کا آغاز ہوا، بعد ازاں ''حکمت قرآن'' بابت مارچ / اپریل ۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ تاہم یہ مضمون گزشتہ چودہ سال سے ادھورا اور نامکمل تھا۔ بھرپور دعوتی و تحریکی مصروفیات کے باعث وہ ضروری فراغت میسر نہ آسکی تھی جو ایسے غامض مضامین کی تحریر کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ بہرکیف، بحمد للہ حال ہی میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ربط کلام کے پیش نظر اس تازہ تحریر کے ساتھ، جو مذکورہ مضمون کی تیسری قسط کی حیثیت رکھتی ہے، سابقہ قسط کو بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ناظم نشر و اشاعت

ترتیب

☆ وجوب سے امکان کا سفر 5

☆ سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ اول
اور اس سے متعلق اصطلاحاتِ قرآنی 6

☆ سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ ثانی 18

☆ سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ ثالث 20

☆ حیاتِ ارضی کا ارتقاء 22

☆ تکمیل تخلیق آدم......اور......عطاءِ خلعت خلافت 29

☆ ابلیس کا اعلانِ بغاوت اور اس کا سبب 31

☆ ابلیس کی انسان دشمنی، اور معرکۂ خیر وشر 34

☆ رحم مادر میں تخلیق آدمؑ کے مراحل کا اعادہ 40

☆ نوعِ انسانی کا ذہنی اور عمرانی ارتقاء 43

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ......﴾ (الحشر: ۲۴)

''وہ اللہ ہے، پیدا کرنے والا، نکال کھڑا کرنے والا، صورت گری کرنے والا......''

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یٰس: ۸۲)

''اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ 'ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے''۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الاعراف: ۵۴)

''آگاہ ہو جاؤ! کہ اسی کے ہیں خلق اور امر (دونوں)، بڑی برکت والا ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا''۔

﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ (الاعلیٰ: ۲،۳)

''جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر راہ معین کی''۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

''وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الھدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے''۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وجوب سے امکان کا سفر

یہ تو سب جانتے ہیں کہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ ''واجب الوجود'' اور ''قدیم'' ہے —— جبکہ کل کون و مکان اور انسان سمیت جملہ مخلوقات و موجودات ''ممکن'' اور ''حادث'' ہیں —— لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ''وجوب'' سے ''امکان'' اور ''قدم'' سے ''حدوث'' کا سفر کیسے اور کن مراحل سے گزر کر طے ہوا —— اور آیا اس طویل سفر میں ''تنزل'' ہی ''تنزل'' ہے' یا کوئی مرحلہ ارتقاء کا بھی آیا ہے؟

اس مشکل بلکہ تقریباً لاینحل مسئلے کا ایک حل تو قدیم منطق اور فلسفے کے ماہرین نے کیا —— کہ ''واجب'' سے ''ممکن'' اور ''قدیم'' سے ''حادث'' کے مابین ''عقولِ عشرہ'' اور ''نُہ افلاک''(۱) تصنیف کر ڈالے جن کے لئے کوئی دلیل نہ تجرباتی علم میں ہے نہ وحیٔ آسمانی میں! اسی طرح بعض متصوف المزاج بزرگوں نے مرتبۂ احدیت و واحدیت وغیرہ کے حوالے سے تنزلاتِ ستہ تجویز کئے' لیکن ان کے لئے بھی کوئی صریح اساس نہ عقل میں ہے نہ نقل میں!

خود وحی آسمانی نے بھی اس کے ضمن میں نہ تفصیلی بحث کی' نہ صراحت سے کام لیا بلکہ صرف ''اشارات'' پر اکتفا کیا۔ اس لئے کہ اس کا اصل مقصد ''ہدایت'' اور ''صراطِ مستقیم'' کی وضاحت ہے اور اس کے ضمن میں بھی اس نے عوام کی ضروریات اور ان کے فہم و شعور کی سطح کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے اور دقیق حقائق و معارف کے ضمن میں اجمالی اشاروں پر اکتفا کیا ہے کہ —— ''عاقلاں را اشارہ کافی است!''

البتہ ع ''عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں!'' کے مصداق وہ ''علم الاسماء'' جو آدم علیہ السلام کو ابتداء ہی میں عطا کر دیا گیا تھا اور اس طرح گویا نوعِ انسانی میں بالقوہ

(۱) دس عقلیں اور نو آسمان!

(Potentially) ودیعت کر دیا گیا تھا' ظہور و بروز کی بے شمار منزلوں سے گزر کر اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ ''تخلیق'' اور ''تسویہ'' کی تحقیق و تفتیش سے بڑھ کر ''تکوین'' یا ''ایجاد و ابداع'' کے در پر دستک دے!

سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ اوّل

اور اس سے متعلق اصطلاحاتِ قرآنی

وحیٔ آسمانی ''تکوین'' یا ''ایجاد و ابداع'' کی اساس اللہ تعالیٰ کے کلمۂ ''کُن'' کو قرار دیتی ہے —— بفحوائے آیاتِ قرآنیہ:

۱) ﴿وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (البقرہ:۱۱۷)

۲) ﴿اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (آل عمران:۴۷)

۳) ﴿سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (مریم:۳۵)

۴) ﴿فَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (المومن:۶۸)

یہ چاروں آیات تو تقریباً ہم معنی ہیں —— اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے اس کا بس یہ کہنا کفایت کرتا ہے کہ ''کُن'' اور وہ ہو جاتی ہے —— البتہ دو مزید آیات میں ذرا اطناب کا انداز ہے:

۵) ﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (النحل:۴۰)

''جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس کے لئے بس ہمارا یہ کہنا ہی (کافی) ہوتا ہے کہ ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے!''

۶) ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ (یٰس:۸۲)

''اس کے اَمر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے کہ 'ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں اللہ تعالیٰ کے فرامین و فرمودات' اوامر و احکام' نوامیس

وقوانین اور فیصلوں اور طے شدہ امور کو ''کلمات'' سے تعبیر کرتا ہے وہاں مندرجہ ذیل دو آیات میں اس کا پورا امکان موجود ہے کہ ''کَلِمَاتُ رَبِّیْ'' اور ''کَلِمَاتُ اللّٰہِ'' کے لاتعداد ہونے سے مراد جہاں اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت کا لامحدود ہونا ہو وہاں اس کی ''مخلوقات'' کا ''لَا یُحْصٰی'' ہونا بھی ہو۔اس لئے کہ فی الواقع اُس کی ''مخلوقات'' ہی اس کے کمالِ علم' کمالِ حکمت اور کمالِ قدرت کی نشانیاں یعنی ''آیات'' ہیں۔اس معنی میں گویا ہر مخلوق اللہ کے ایک کلمہ ''کُن'' کا ظہور ہے:

۱) ﴿قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِہٖ مَدَدًا﴾ (الکہف:۱۰۹)

''کہہ دو کہ میرے پروردگار کے کلمات کے لئے اگر سمندر روشنائی بن جائے تو وہ بھی ختم ہو جائے گا اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔خواہ اس جیسا ایک اور سمندر لے آئیں مدد کے لئے!''

۲) ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ﴾ (لقمٰن:۲۷)

''اور اگر زمین کے کل درخت قلم بن جائیں اور سمندر (سیاہی کا کام دے اور) اس کے بعد سات سمندر اور ہوں مدد کے لئے' تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔''

مندرجہ بالا آیات کے عمومی اسلوب سے قطع نظر قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات وایجادات میں سے تعین کے ساتھ صرف حضرت مسیح علیہ السلام کو ''کَلِمَۃُ اللّٰہِ'' قرار دیا گیا ہے —— جیسے سورۂ آل عمران کی آیت ۳۰ میں حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ علیہما السلام کی ولادت کی خوش خبری کے ضمن میں حضرت یحییٰؑ کو ﴿مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ قرار دیا گیا ہے —— اور ذرا آگے چل کر آیت ۴۵ میں حضرت مریمؑ کو حضرت مسیحؑ کی بشارت کے ضمن میں ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں —— اور اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰہَا اِلٰی مَرْیَمَ﴾

''بے شک مسیح یعنی مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا رسول ہے اور اُس کا 'کلمہ' جو القاء فرمایا اس نے مریم کی جانب!''

اس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کی ''تخلیق'' اور ''تسویہ'' کے ساتھ ساتھ ''تقدیر'' اور ''ہدایت'' کا سلسلہ بھی قائم فرما دیتا ہے' بفحوائے:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی o الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی o وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی﴾ (الاعلٰی:۱ تا ۳)

''تسبیح کرو اپنے اُس رب کی جو سب سے بالا وبرتر ہے' جس نے بنایا پھر سنوارا' جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر راہ معین کی۔''

یہی تقدیر و ہدایت ہے جو ''جمادات'' کی سطح پر ''قوانینِ طبعیہ'' یعنی (Physical Laws or Laws of the Nature) کی شکل اختیار کرتی ہے۔نباتات کے معاملے میں خالص طبعی قوانین پر حیاتیاتی قوانین (Biological Laws) کا اضافہ ہوتا ہے۔مزید آگے چل کر ''حیوانات'' کے ضمن میں ان دونوں اقسام کے قوانین پر جبلی قوانین (Instincts) کا اضافہ ہوتا ہے۔اور انسان کے معاملے میں ان تینوں پر اضافہ ہوتا ہے ''استدلالی قوانین'' (Rules of Logic) کا —— جس سے بالاتر سطح صرف ''وحی ربانی'' کی ہے! —— تو جملہ مخلوقات کے معاملے میں جہاں تک معاملہ ان قوانین کے تحت چلتا رہے اللہ تعالیٰ کے کسی ''اضافی'' ''امر'' ''کُن'' کی ضرورت نہیں ہوتی —— لیکن جہاں ان میں کوئی تبدیلی مطلوب ہو یعنی —— عمومی سلسلۂ اسباب ونتائج (Cause and Effect) یا ''عادی قانون'' کو توڑ کر اللہ اپنی کسی مشیتِ خصوصی کو ظاہر فرمانا چاہے (چنانچہ اسی کو ''خرقِ عادت'' یا ''معجزے'' سے تعبیر کیا جاتا ہے!) تو ایک نئے ''امر'' ''کُن'' کی ضرورت ہوتی ہے' یا جب عام اسبابِ عادیہ کی کسی کڑی کو حذف کرنا ہو تو ایک اضافی کلمۂ ''کُن'' اس کڑی کی جگہ لیتا ہے —— چنانچہ یہ ہے وہ صورت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں پیش آئی کہ انسانی سلسلۂ تناسل جو عام طبعی اور حیاتیاتی قوانین کے مطابق ''مرد'' اور ''عورت'' کے ''نطفۂ امشاج'' سے شروع ہوتا ہے' آنجنابؑ کے معاملے میں اس

قدر بدل گیا کہ آپؑ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی‘ گویا ایک کڑی حذف ہوگئی اوراللہ کے ایک کلمہ ’’کُن‘‘ نے ایک کڑی کی جگہ لے لی —— چنانچہ وہ ’’کَلِمَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ‘‘ یا ’’کَلِمَۃٌ مِّنْہُ‘‘ یا ’’کَلِمَتُہٗ‘‘ قرار پائے۔

یہ بات ’’متکلمین‘‘ کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ ’’کلام‘‘ —— ’’متکلم‘‘ کی صفت ہوتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال نے قرآن حکیم کو ’’مثلِ حق‘‘ قرار دیا ہے ؎

’’مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست او
زندہ و پایندہ و گویاست اُو!!‘‘

اور صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں یہ بات بھی بدیہی اور متفق علیہ ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے مانند اطلاقی شان کی حامل ہیں —— رہی ’’ذات‘‘ اور ’’صفات‘‘ کی باہمی نسبت یعنی علامہ اقبال کے الفاظ میں ع ’’ہیں صفات ذاتِ حق‘ حق سے جُدا یا عینِ ذات؟‘‘ تو اس تقریباً لاینحل مسئلے کا حل بھی ’’لَا عَیْنٌ وَلَا غَیْرٌ‘‘ کے سوا اور کوئی نہیں۔ (خواہ یہ بظاہر کتنا ہی مہمل نظر آئے۔)

لہٰذا ذاتِ باری تعالیٰ کا وہ کلمہ ’’کُن‘‘ بھی جو موجودہ کون و مکان کے کل سلسلۂ تکوین و تخلیق کا نقطۂ آغاز بنا‘ ابتداء میں لازماً ’’مطلق‘‘ و ’’لامحدود‘‘ —— اور ’’کیف‘‘ و ’’کم‘‘ کے جملہ تصورات سے ماوراء تھا۔ البتہ اسی کلمۂ کُن نے ’’تنزلات‘‘ کی منزلیں طے کرنی شروع کیں جن کے ذریعے ’’وجوب‘‘ سے ’’امکان‘‘ —— اور ’’قِدم‘‘ سے ’’حدوث‘‘ کی جانب سفر شروع ہوا۔

گویا ’’تنزلات‘‘ کی نسبت ذاتِ باری کی جانب نہیں اس کلمہ ’’کُن‘‘ کی جانب ہے! —— یہی وجہ ہے کہ امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کُل کون و مکان اور جملہ موجودات و مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے ’’اظلال‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس مرحلے پر یوحنا کی انجیل کے ابتدائی چند جملے بہت دلچسپی کا باعث ہوں گے اگرچہ صاف نظر آتا ہے کہ وہ وحیٔ ربّانی کی بجائے کسی فلسفیانہ اور متکلمانہ ذوق کے حامل انسان کے ذہن سے نکلے ہیں:

’’ابتدا میں کلام تھا —— اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی‘‘۔ (یوحنا‘ باب اول: ۱ تا ۳)

قرآن حکیم کی اساسی اصطلاحات میں ’’کلمہ‘‘ ہی کی طرح جامع اور گھمبیر اصطلاح ’’امر‘‘ کی بھی ہے —— بنیادی طور پر یہ قرآن مجید کے چند نہایت کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہے۔ چنانچہ لفظ ’’امر‘‘ کہیں ’’مسئلہ‘‘ یا ’’معاملہ‘‘ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے‘ کہیں ’’حکم‘‘ یا ’’فیصلہ‘‘ کا مفہوم ادا کرتا ہے‘ کہیں ’’اختیار‘‘ اور ’’قدرت‘‘ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کہیں اردو زبان کے کثیر المفہوم لفظ ’’بات‘‘ کے معنی میں آتا ہے —— اور ان جملہ مفاہیم کے علاوہ اس کا ایک خاص ’’اصطلاحی‘‘ مفہوم بھی ہے جس کے اعتبار سے یہ ’’خلق‘‘ کا مقابل‘ یا کم از کم ’’مغائر‘‘ ضرور ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ میں جہاں واوِ عطف نے ’’خلق‘‘ اور ’’امر‘‘ کو اللہ کی ملکیت مطلقہ یا اختیارِ مطلق کے تحت ’’جمع‘‘ کر دیا ہے وہاں ان دونوں کے مابین ’’نسبتِ مغائرت‘‘ بھی قائم کر دی ہے:

﴿اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الاعراف: ۵۴)

’’آگاہ ہو جاؤ! کہ اُسی کے ہیں خلق اور امر (دونوں) بڑی برکت والا ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا!‘‘

اس ’’امر‘‘ کے بارے میں دو باتیں نہایت اہم اور لائق توجہ ہیں!

ایک یہ کہ قرآن حکیم کی جن آیات میں ’’کُنْ فَیَکُوْنُ‘‘ کی تکوینی شان کا بیان ہوا ہے ان سب میں بلا استثناء ’’امر‘‘ ہی کا لفظ آیا ہے —— ’’خلق‘‘ کا لفظ کسی ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوا —— یعنی یہ انداز کسی ایک جگہ بھی نہیں ملتا کہ ’’اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّخْلُقَ شَیْئًا فَاِنَّمَا

نَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ“ —— اور قرآن کے مقامِ رفیع سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ اسے محض ایک اتفاق مانا جائے‘ بقول غالبؔ:

”گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالبؔ میرے اشعار میں آوے!!“

اور —— ع ”زیرِ ہر ہر لفظِ غالبؔ چیدہ ام میخانۂ!!“

دوسرے یہ کہ اس کا ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق لفظ ”روح“ کے ساتھ ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱) ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵)

”اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں‘ کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے۔“

۲) ﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ﴾ (النحل: ۲)

”وہ فرشتوں کو اپنے امر کی روح کے ساتھ اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے۔“

۳) ﴿يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (المومن: ۱۵)

”وہ ڈالتا ہے روح‘ جو اس کے امر میں سے ہے‘ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔“

۴) ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

”اور اس طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔“

ان آیاتِ مبارکہ میں سے دوسری اور تیسری آیات میں ”اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِهٖ“ سے مراد بالاتفاق مطلقاً وحیٔ نبوت ہے‘ چوتھی آیت میں معین طور پر وحیٔ قرآنی کا ذکر ہے —— پہلی آیت میں بھی بعض حضرات کے نزدیک مراد وحیٔ قرآنی ہی ہے —— لیکن جمہور کے نزدیک اس سے مراد ”روحِ انسانی“ ہے۔ بہرحال سرِدست اصل قابلِ توجہ معاملہ ”روح“ اور ”امر“ کے مابین قریبی رشتے اور تعلق کا ہے!!!

اب اگر قرآن حکیم میں لفظ ”روح“ کے دوسرے استعمالات و اطلاقات پر غور کیا جائے تو جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے:

۱) چار مقامات (البقرہ: ۸۷‘ ۲۵۳ —— المائدۃ: ۱۱۰ —— النحل: ۱۰۲) پر ”رُوْحُ الْقُدُسِ“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں (۱) —— اور ایک مقام (الشعراء: ۱۹۳) پر ”اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ“ کے الفاظ آئے ہیں‘ (۲) اور ان تمام مقامات پر مراد غالب اکثریت کے نزدیک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں!

۲) دو مقامات (المعارج: ۴ اور القدر: ۴) پر ﴿اَلْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ کے الفاظ آئے ہیں (۳) اور ایک مقام (النباء: ۳۸) پر ﴿اَلرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ کے (۴) —— اور اگرچہ بعض رائیں اور بھی پائی جاتی ہیں لیکن جمہور کے نزدیک یہ عام پر خاص یا خاص پر عام کے عطف کا معاملہ ہے —— اور ”اَلرُّوْحُ“ سے مراد ان مقامات پر بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں! دوسرے نمبر پر رائے یہ ہے کہ اس سے مراد ہیں ”ارواحِ انسانیہ“ یا وہ عظیم ترین فرشتہ جو گویا ارواحِ انسانیہ کا مخزن ہے!

۳) سورۂ مجادلہ (آیت ۲۲) میں مؤمنین صادقین کے لئے اللہ تعالیٰ کی تائید کے ضمن میں ﴿اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ﴾ کے الفاظ آئے ہیں‘ جس سے مراد ہے اللہ کی ”غیبی“ مدد جو

---

(۱) ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (البقرۃ: ۸۷ و ۲۵۳)
﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا﴾ (المائدہ: ۱۱۰)
﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: ۱۰۲)

(۲) ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (الشعراء: ۱۹۳)

(۳) ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج: ۴)
﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ (القدر: ۴)

(۴) ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ (النباء: ۳۸)

جیسا کہ قرآن حکیم کے دوسرے مقامات (جیسے سورۂ انفال: ۱۲ اور سورۂ آل عمران ۱۲۴، ۱۲۵)[۱] سے معلوم ہوتا ہے' اکثر ملائکہ ہی کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔

۴) اپنی ذات مبارکہ کی جانب اضافت کی نسبت کے ساتھ لفظ ''روح'' کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں چھ مقامات پر استعمال فرمایا ہے: تین بار تخلیقِ انسانی کے ضمن میں کہ ''تخلیق'' اور ''تسویہ'' کے مراحل کی تکمیل کے بعد اس میں اللہ نے ''اپنی روح'' میں سے پھونکا (السجدۃ: ۹' الحجر: ۲۹ اور ص: ۷۲)[۲] —— اور تین ہی بار حضرت مریمؑ کے ذکر میں —— جن میں سے دو مقامات (الانبیاء: ۹۱ اور التحریم: ۱۲) پر حضرت صدیقہؑ کے بطن میں حضرت مسیحؑ کے استقرارِ حمل کے ضمن میں فرمایا گیا کہ ''ہم نے اپنی روح میں سے پھونکا''[۳] —— اور ایک مقام (مریم: ۱۷) پر بایں طور کہ جو فرشتہ انہیں حضرت مسیحؑ کی بشارت دینے کے لئے بھیجا گیا تھا' اسے ''رُوْحَنَا'' (ہماری روح) سے تعبیر فرمایا گیا۔[۴]

۵) آخری —— اور موضوعِ زیر بحث کے اعتبار سے اہم ترین —— یہ کہ سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کو ''کلمۃ'' سے تعبیر فرمایا گیا —— وہاں

---

(۱) ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال: ۱۲)
﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُنْزَلِیْنَ o بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَ o﴾ (آل عمران: ۱۲۴، ۱۲۵)

(۲) ﴿ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ﴾ (السجدہ: ۹)
﴿فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ o﴾ (الحجر: ۲۹ و ص: ۷۲)

(۳) ﴿وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰھَا وَابْنَھَآ اٰیَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیاء: ۹۱)
﴿وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّھَا وَکُتُبِہٖ وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ o﴾ (التحریم: ۱۲)

(۴) ﴿فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا﴾ (مریم: ۱۷)

''رُوْحٌ مِّنْہُ'' بھی قرار دیا گیا![۱]

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کُن'' —— اس کے ''امر'' اور لفظ ''روح'' کے مابین بڑا قریبی رشتہ و تعلق ہے —— اور ملائکہ' ارواحِ انسانیہ اور وحی کم و بیش ایک ہی قبیل کی حقیقتیں ہیں!

ملائکہ' ارواحِ انسانیہ اور وحی کے باہمی قرب —— اور ذات باری سبحانہ وتعالیٰ سے ان کے قریبی تعلق کو ظاہر کرنے والا ایک مزید لفظ ''نور'' ہے۔ چنانچہ:

۱) یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے کہ قرآن حکیم ''وحی'' کو نور قرار دیتا ہے جیسے سورۂ مائدہ کی آیات ۴۴ و ۴۶ میں تورات اور انجیل دونوں کو ﴿ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾[۲] سے تعبیر فرمایا گیا اور سورۂ انعام کی آیت نمبر ۹۱ میں تورات کیلئے ﴿نُوْرًا وَّ ھُدًی لِّلنَّاسِ﴾[۳] کے الفاظ وارد ہوئے اسی طرح خود قرآن حکیم کیلئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ﴿نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾[۴] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں ﴿اَلنُّوْرُ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ﴾[۵] اور سورۂ تغابن کی آیت ۸ میں ﴿وَالنُّوْرِ الَّذِیْ

---

(۱) ﴿اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ ج اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ﴾ (النساء: ۱۷۱)

(۲) ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰۃَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (المائدہ: ۴۴)
﴿وَاٰتَیْنٰہُ الْاِنْجِیْلَ فِیْہِ ھُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (المائدہ: ۴۶)

(۳) ﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِہٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّھُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَہٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَھَا وَتُخْفُوْنَ کَثِیْرًا﴾ (الانعام: ۹۱)
﴿فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ o﴾ (الحجر: ۲۹ و ص: ۷۲)

(۴) ﴿قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ﴾ (المائدہ: ۱۵)

(۵) ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ لا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

اَنۡزَلۡنَا﴾[1] کے الفاظ استعمال فرمائے!

۲) فرشتوں کے بارے میں حدیثِ نبویؐ (مسلمؒ عن عائشہؓ) میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ''اللہ نے انہیں نور سے پیدا فرمایا۔''

۳) روحِ محمّدیؐ کے بارے میں ایک مشہور حدیث میں' جو اگرچہ محدثین کے معیار جرح و تعدیل پر تو پوری نہیں اترتی تاہم اکثر صوفیاء ہی نہیں مفسرین نے بھی اسے قبول فرمایا ہے، ''نور'' ہی کا لفظ آیا ہے یعنی ''اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوۡرِیۡ'' —— اسی طرح ایک اور حدیث جس کا حوالہ تو تاحال دستیاب نہیں ہوسکا لیکن معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا غلام مرشد مرحوم اسے اپنے دروس میں بیان فرمایا کرتے تھے' اس کی رو سے حضرت جابرؓ کے اس سوال کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا —— جواباً آنحضور ﷺ سے منقول ہے کہ ''نُوۡرُ نَبِیِّكَ یَا جَابِرُ' نُوۡرُ نَبِیِّكَ!!'' (یہ روایت اغلباً مصنف عبدالرزاقؒ میں موجود ہے)۔

۴) خود ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے' انسانی ذہن کی محدودیت اور نارسائی کے پیشِ نظر' قریب ترین لفظ جو بطور تمثیل اختیار کیا گیا' وہ ''نور'' ہی ہے —— جیسے سورۂ نور کی آیت ۳۵ ﴿اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ کے الفاظ مبارکہ —— اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے منقول ''نُوۡرٌ اَنّٰی یُرٰی'' کے الفاظ۔

ان حقائق کے پیشِ نظر کیا یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس یا دور کی کوڑی لانا قرار دیا جا سکتا ہے کہ:

تخلیقِ کائنات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے اوّلین کلمہ ''کُن'' نے اپنے تنزل کے مرحلۂ اوّل میں ایک نورِ بسیط کی صورت اختیار کی —— اور اس سے اللہ تعالیٰ نے خلعتِ وجود عطا فرمایا، ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ کو' جن کی اصل ''نور'' ہے —— اور جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور ہی نہیں ''خود شعوری'' کی نعمتِ عظمیٰ

[1] ﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَالنُّوۡرِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلۡنَا﴾ (التغابن: ۸)

سے بھی سرفراز ہیں!

اور اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ ان ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ میں سب سے پہلے خلعتِ وجود سے سرفراز ہونے والی ہستی ''نورِ محمدی ﷺ'' —— یعنی ''روحِ محمّدیؐ'' ہی ہو' —— فِدَاہُ آبَاءُنَا وَاُمَّھَاتُنَا!!

واضح رہے کہ قرآن حکیم جس طرح نہ صرف شعور بلکہ شعورِ ذات کی حامل ان دونوں انواع (یعنی فرشتوں اور ارواحِ انسانیہ) کو ''عالمِ امر'' سے متعلق قرار دیتا ہے اسی طرح ان کے باہمی مخاطبہ و مکالمہ —— اور خود اللہ تعالیٰ کے ان دونوں سے خطاب و کلام کو بھی —— جس کا اصطلاحی نام ''وحی'' ہے ''عالمِ امر'' سے متعلق قرار دیتا ہے —— اس موضوع پر قرآن کا ''ذروہ سنام'' یعنی اہم ترین مقام سورۂ شوریٰ کی آیات ۵۱' ۵۲ ہیں:

﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِہٖ مَا یَشَآءُ ط اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ○ وَکَذٰلِكَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ط مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّھۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَھۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ○﴾

''اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے' یا پردے کی اوٹ سے' یا بھیجے کسی فرشتہ کو' پس وہ وحی کر دے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ بڑا ہی عالی مقام' بڑا ہی حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے' نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں' اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

ان آیات مبارکہ میں ''روح'' —— ''امر'' —— ''وحی'' —— اور ''نور'' کے الفاظِ مبارکہ جو ہماری اس پوری بحث کا مبنیٰ اور مدار ہیں' جس شان سے وارد ہوئے ہیں' اس کی کوئی دوسری مثال اغلباً خود قرآن میں موجود نہیں ہے (واللہ اعلم!)۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے

ان دوآیات کواس موضوع پر قرآن کا ''ذروۂ سنام'' قرار دیا ہے۔

(نوٹ: اس تحریر کا یہاں تک کا حصہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوگیا تھا)

الغرض! ایجاد وابداع سے تخلیق وتسویہ تک کے طویل سفر کا مرحلۂ اوّل —— یا بالفاظ دیگر سلسلۂ ''تنزلات'' کی پہلی منزل —— جس سے قرآن حکیم کی اہم اصطلاحات: کلمہ و کلمات' رُوح و وحی اور اَمر و نور متعلق ہیں، اغلبًا یہ تھی کہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے اَمر ''کُن'' نے ایک ایسے نہایت لطیف و بسیط' اور خنک و پُرسکون ''نور'' کی صورت اختیار کر لی جس میں نہ حرارت وتپش تھی' نہ حرکت وتموج! —— اور اس مرحلہ پر اسی نورِ بسیط سے تخلیق کی گئیں دو صاحب تشخص' اور صرف صاحبِ شعور و ارادہ ہی نہیں بلکہ حاملِ شعورِ ذات (Self-Conscious) مخلوقات' یعنی: ایک ''روحُ القدس'' اور ''الروح الامین'' یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام سمیت جملہ ملائکہ کرام جن کی تعداد لَا یُحَاطُ بھی ہے اور لَا یُحْصٰی بھی (بمصداق: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ!﴾[1] (المدثر:۳۱) اور جن کے بارے میں یہ صراحت بھی حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہے کہ ان کی تخلیق ''نور'' سے ہوئی' (مسلمؒ عن عائشہؓ) اور دوسرے روحِ آدمؑ اور رُوحِ مُحمّدیؐ سمیت نسل آدم کے اُن تمام افراد کی ارواح جو تا قیامِ قیامت پیدا ہوں گے۔ یہ ارواحِ انسانیہ جو ''جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ'' کی شکل میں تھیں' (مسلمؒ عن ابی ہریرۃؓ) ان سے اوّلاً ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ نے یہ عہد لیا کہ وہ اُسے ہی اپنا رب تسلیم کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی (بمصداق ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰى﴾[2] (الاعراف:۱۷۲) پھر ان پر ''اِمَاتَةُ الْاُوْلٰى'' کی نیند طاری کر کے انہیں ایک ''مخزنِ ارواح'' میں محفوظ کر دیا' جہاں سے وہ اپنے اپنے وقت پر منشعب ہو کر اجسادِ انسانیہ میں پھونکی جاتی ہیں۔ (جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک رائے کے مطابق یہ ''مخزنِ ارواح'' ہی وہ ملکِ اعظم ''الرُّوح'' ہے جس کا ذکر ملائکہ کے ساتھ معطوف یا

(۱) ''اور کوئی نہیں جانتا تیرے رب کے لشکر کو مگر خود وہی۔''

(۲) ''(تمہارے رب نے پوچھا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ضرور (آپ ہی ہمارے رب ہیں!)

معطوف علیہ کے طور پر قرآن مجید میں تین بار آیا ہے۔ المعارج:۴' النبا:۳۸' اور القدر:۴)

واضح رہے کہ تنزلات کے اس مرحلۂ اوّل پر وجود میں آنے والے عالمِ نورانی میں ابھی زمانِ جاری (Serial Time) کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا لہٰذا اس مرحلے پر خلعت وجود سے مشرف ہونے والی ہستیاں یعنی ملائکہ اور ارواحِ انسانیہ بھی زمان و مکان کی محدودیتوں سے ماوراء ہیں اور ان کے عرش سے فرش اور بالعکس فرش سے عرش تک —— اور مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک منتقل ہونے میں کوئی ''وقت'' صرف نہیں ہوتا! بلکہ یہ آنِ واحد میں مشرق سے مغرب اور فرش سے عرش تک کا سفر طے کر سکتی ہیں!

سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ ثانی

سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ ثانی عالمِ اَمر سے عالمِ خلق کی جانب تنزل کی پہلی منزل ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جس تک ایک مبہم اور مجمل رسائی جدید علم طبیعیات کو بھی حاصل ہو چکی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ خام خیالی تحلیل ہو کر معدوم ہو چکی ہے جو نیوٹن کے دور کی طبیعیات سے پیدا ہوئی تھی' یعنی یہ کہ یہ مادی کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کے برعکس اب محققین کا اس پر تقریبًا اجماع ہو چکا ہے کہ اس عالمِ مادی کا آغاز اب سے لگ بھگ پندرہ سے بیس ارب سال قبل Big Bang سے ہوا۔ یعنی ایک بہت بڑے دھماکے سے! یہ دھماکہ کب ہوا اور کہاں ہوا ان سوالات کے جواب میں تو علماء طبیعیات یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ اس سے قبل زمان ومکان کا جداگانہ تشخص تھا ہی نہیں کہ کب اور کہاں کے سوال پیدا ہوں۔ گویا کہ زمان ومکان کا تو نقطۂ آغاز ہی Big Bang ہے! رہے یہ سوالات کہ یہ دھماکہ کس نے کیا اور اس کے لئے بارود کونسا تھا تو ان میں سے پہلے سوال سے تو مادہ پرستوں کے لئے اعراض اس لئے ضروری ہے کہ اس سے لامحالہ ایک واجب الوجود مُبدع ومُوجد کا تصور سامنے آتا ہے —— اور دوسرے سوال کا جواب ان کے لئے اس بنا پر ممکن نہیں کہ Big Bang سے ماقبل کا تعلق عالمِ اَمر سے ہے جس تک علومِ طبیعی کی رسائی محالِ عقلی ہے!

بہر حال ذاتِ واجب الوجود پر ایمان اور اُس (تعالیٰ) کے پہلے امر ''کُن'' سے وجود میں آنے والے عالمِ نور کا ادراک رکھنے والوں کے لئے یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ یہ دھماکہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک دوسرے امر ''کُن'' کے نتیجے میں نورِ بسیط کے ایک حصّے میں ہوا جس کے نتیجے میں اس ''نور'' نے عہدِ حاضر کے عظیم ماہر طبیعیات سٹیون وائن برگ کے قول کے مطابق ایک ایسی ''نار'' کی شکل اختیار کر لی جو ایسے نہایت چھوٹے ذرات (Electrons, Positrons and Neutrinos) پر مشتمل تھی جن کا درجۂ حرارت ناقابلِ تصور حد تک بلند (One Hundred Thousand Million Degrees Centrigrade) تھا اور جو ناقابلِ تصور سرعت رفتار کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے —— جس کے نتیجے میں یہ آتشیں گولہ حجم میں تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت اور ان کے باہمی کشش ثقل کی قوّت وشدت دونوں میں کمی آتی چلی گئی !!

الغرض! یہ تھا عالمِ مادی کا نقطۂ آغاز اور مراتبِ نزول کا مرحلۂ ثانی۔ بعد میں مرورِ زمانہ اور اساسی ذرات کے ایک دوسرے سے دُور بھاگنے سے یہ ناری ہیولیٰ یا بگولا مختلف حصوں میں پھٹتا بھی چلا گیا جس سے کہکشائیں وجود میں آئیں اور ہر کہکشاں میں ناری کرے پیدا ہوئے جن میں متذکرہ بالا اساسی ذرات کی تالیف سے ایٹم اور پھر اس کے مرکبات وجود میں آتے چلے گئے۔

بہر حال اس ناری مرحلے پر جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور وارادہ مخلوق پیدا کی گئی وہ ''جنات'' تھے جن کا مادۂ تخلیق قرآن کی جا بجا صراحت کی بنا پر آگ ہے —— اور جن کی تخلیق حضرت آدمؑ کی تخلیق سے بہت پہلے ہوئی۔ (بحوائے: ﴿وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴾ (۱) الحجر:۲۷)

واضح رہے —— کہ جیسے ''نور'' اور ''نار'' میں قرب مسلّم ہے، اسی طرح جنات کو بھی ملائکہ کے ساتھ قرب اور مانوسیت کا تعلق حاصل ہے —— چنانچہ اسی کا ایک شاہکار نتیجہ یہ

(۱) ''اور اس سے پہلے جنّوں کو ہم آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے''۔

ہے کہ عزازیل نامی جن، جو بعد میں ابلیس اور شیطانِ لعین قرار پایا، اپنے علم وزہد اور طاعت وتقویٰ کی بنیاد پر ملائکہ کرام کے طبقۂ اسفل کے ساتھ صرف گھل مل ہی نہیں گیا تھا بلکہ بقولِ بعض اس نے ان کے ''معلم'' کی حیثیت بھی اختیار کر لی تھی (اللہ اعلم!) —— اور اسی کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اگرچہ جنات کی رسائی ملائکہ کے طبقۂ اعلیٰ تک تو نہیں ہے ﴿لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى﴾ (۱) (الصّٰفّٰت:۸) تاہم چوری چھپے سن گن لینے ﴿اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ﴾ (۲) (الحجر:۱۸) اور تدبیر وتعمیل احکامِ الٰہی کے لئے فرشتوں کے نزول کے دوران ان سے کچھ معلومات ''اچک'' لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں —— مزید برآں چونکہ ان کا تعلق عالمِ مادی سے ہے لہٰذا ان کی حرکت اور سفر وقت کے صرف کے ساتھ ہوتا ہے، اگرچہ اپنے مادۂ تخلیق کی لطافت کی بنیاد پر ان کی رفتار بھی بہت تیز ہے اور ان کی جولان گاہ بھی کائناتِ مادی کے دُور دراز گوشوں تک ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ ان دُور دراز مقامات پر بھی از خود بآسانی پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان ارب ہا ارب ڈالروں کے صرف سے تیار شدہ راکٹوں کے ذریعے بمشکل پہنچ پاتا ہے —— بلکہ ان کی رسائی اس سے بھی بہت آگے ہے جہاں ہم تا حال پہنچ بھی نہیں پائے! —— اور آخری بات یہ کہ مادۂ تخلیق کی اس لطافت کی بنا پر یہ بھی فرشتوں ہی کی طرح مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں —— یعنی جیسے فرشتے انسانوں کی صورت میں متمثّل ہو سکتے ہیں (جیسے مثلاً ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (۳) مریم:۱۷) ایسے ہی جنات بھی انسانوں اور حیوانات بالخصوص حیات یعنی سانپوں کی شکل اختیار کر سکتے ہیں!

سلسلۂ تنزلات کا مرحلۂ ثالث

سلسلۂ تنزلات کی تیسری کڑی اُس وقت شروع ہوئی جب بہت سے ناری کُرّے

(۱) ''یہ (جنات) ملاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے''۔

(۲) ''الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے''۔

(۳) ''پس وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا''۔

ٹھنڈے پڑنے شروع ہوئے —— جن میں ایک ہماری زمین بھی ہے۔ ٹھنڈے ہونے کے اس عمل کے دو نتائج ظاہر ہوئے: ایک یہ کہ جیسے کوئی انگارہ ٹھنڈا ہونے لگے تو اس کی سطح پر راکھ کی تہہ جم جاتی ہے اسی طرح کرۂ ارضی پر بھی ''خاک'' کی ایک تہہ پیدا ہوگئی جسے زمین کا چھلکا (Crust of the Earth) کہا جاتا ہے اور جو کُل حیاتِ ارضی' نباتاتی و حیواناتی کا مادۂ تخلیق ہے —— اور دوسرے یہ کہ زمین سے کچھ بخارات نکل کر اس کے گرد جمع ہوگئے جن سے زمین کا غلاف یعنی ''فضا'' وجود میں آئی۔ اور پھر اسی فضا میں موجود ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی وجود میں آیا جو کُل حیاتِ ارضی کے لئے ''منبعِ حیات'' ہے (بفحوائے: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۱) الانبیاء: ۳۰) اور اس نے موسلا دھار بارش کی صورت میں واپس زمین ہی پر برسنا شروع کر دیا۔ گویا اس سلسلۂ تخلیق کا ایک مرحلہ وہ بھی تھا جس میں زمین پر سوائے پانی کے کچھ اور نہ تھا۔ اور غالباً اسی کی جانب اشارہ ہے قرآن حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ﴾ (۲) (ھود: ۷) —— اور ادھر چونکہ زمین کی چمڑی (Crust) ٹھنڈے ہونے کے باعث سکڑ بھی گئی تھی لہٰذا سطحِ زمین پر نشیب و فراز پیدا ہوگئے۔ چنانچہ ایک جانب پہاڑ اور ان سے ملحق سطحِ مرتفع کے مختلف مدارج و مراحل کی صورت میں خشکی پیدا ہوئی تو دوسری جانب نشیبی علاقوں میں بارش کے پانی کے جمع ہونے کے باعث سمندر وجود میں آ گئے اور پھر ساحلی علاقوں میں حیاتِ ارضی کے ''مادۂ تخلیق'' یعنی مٹی یا تراب' اور اس کے ''منبع حیات'' یعنی پانی کے مابین تعامل سے ''ارتقاء'' کا وہ مرحلہ وار عمل شروع ہوا' جس کی انتہا حضرت آدمؑ نہیں بلکہ صرف حیوانِ آدم (Homo Sapiens) کا ظہور تھا —— گویا بقولِ بیدلؒ ۔

''ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش!''

(۱) ''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی''۔
(۲) ''اور اس کا عرش پانی پر تھا''۔

حیاتِ ارضی کا ارتقاء

یہ بات بالکل غلط طور پر مشہور ہوگئی ہے کہ نظریۂ ارتقاء کا موجد برطانوی سائنس دان چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) تھا اور اس غلط مفروضے کی شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ عوام الناس میں ارتقاء اور ''ڈارونزم'' تقریباً مترادف ہوگئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک حیاتِ ارضی میں ارتقاء کے مسئلے کا فی نفسہٖ تعلق ہے' اس کا دھندلا سا تصور تو ارسطو سمیت متعدد قدیم یونانی حکماء کے یہاں بھی موجود تھا۔ پھر اس کا نہایت واضح نقشہ صدیوں پہلے مسلمان حکماء اور علماء پیش کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ جاحظ (م ۲۲۵ھ)' پھر اخوان الصفا' اور پھر علامہ ابنِ مسکویہ (م ۴۲۱ھ) نے جو کچھ کہا اس کا ذکر تو فی الوقت مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ لیکن مولانا روم (م ۱۲۷۳ء) نے ڈارون سے لگ بھگ چھ سو برس قبل اپنی شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ''مثنوی'' میں دو مقامات پر جس قدر واضح الفاظ میں ارتقاءِ حیاتِ ارضی کا نقشہ پیش کیا ہے وہ تو سب کے سامنے ہے۔

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ ڈارون نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۷ء تک پورے پانچ سال جنوبی امریکہ کے پورے ساحل کے گرد سفر کر کے حیاتِ ارضی کے جو نمونے جمع کئے اور پھر ان کے مابین انسانوں کے ''شعوب'' اور ''قبائل'' (الحجرات: ۱۳) کے مانند حیوانات کی ''انواع'' (Species) کا جو شجرۂ نسب مرتب کیا' وہ اس کی ایک بہت بڑی علمی خدمت تھی' لیکن ''ڈارونزم'' اصلاً عبارت ہے اس نظریئے سے جو ڈارون نے ارتقاءِ حیات کے سبب اور اس کے عمل میں آنے کے طریق یعنی میکانزم کے بارے میں مرتب کیا' اور جسے عوام الناس میں تو یقیناً بہت پذیرائی حاصل ہوئی لیکن خالص علمی حلقوں میں یہ نظریہ ہمیشہ متنازعہ ہی رہا' اور اب بھی اگرچہ سائنس کی عمومی رو میں تو اسی کا ڈنکا بج رہا ہے تاہم علماء و ماہرین علم الحیات کے حلقے میں اس پر شدید اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں۔ اور اس کی بجائے اب علمی دُنیا میں ڈارون سے متصلاً قبل فرانسیسی سائنس دان لامارک (۱۷۴۴ء تا ۱۸۲۹ء) نے جو خیالات پیش کئے تھے ان کے مشابہ خیالات زیادہ مقبول ہو چکے ہیں!

بہرحال، نفس ارتقاء کے ضمن میں مولانا روم کی جانب رجوع کریں تو اوّلاً مثنوی کے دفتر سوم میں آنجناب فرماتے ہیں:

از جمادیٰ مُردم و نامی شدم
وز نما مُردم بحیواں سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمُردن کم شوم!

یعنی ''(میں اوّلاً عالمِ جمادات میں تھا —— پھر) اس جماداتی عالم میں میری موت واقع ہوئی تو میں عالمِ نباتات میں پیدا ہوگیا۔ پھر عالمِ نباتات میں موت واقع ہوئی تو میں عالمِ حیوانات میں وارد ہوگیا۔ پھر عالمِ حیوانات میں موت واقع ہوئی تو میں آدم بن گیا۔ پس مجھے کیا خوف لاحق ہوسکتا ہے کہ اب کوئی اور موت واقع ہونے سے میرے وجود یا میری حیثیت میں کوئی کمی واقع ہوجائے گی!'' —— بلکہ اس مقام پر تو مولانا رومؒ مقامِ آدمیت سے آگے کے دو مزید مراحل ارتقاء کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے اس وقت کے دائرہ بحث سے خارج ہیں!

پھر اس سے بھی کہیں زیادہ واضح اور واشگاف الفاظ میں مولانا رومؒ مثنوی کے دفتر چہارم میں باضابطہ اس عنوان کے تحت کہ: ''بیانِ اطوار و منازلِ خلقتِ آدمی از ابتدائے خلقت''، یعنی ''ابتداءِ تخلیق سے تخلیق آدم تک کے مراحل کا بیان'' فرماتے ہیں:

آمدہ اوّل باقلیمِ جماد
وز جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد
وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیوانی فتاد
نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد

- - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - -

باز از حیواں سوئے انسانیش
می کشد آں خالقے کہ دانیش
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت!

یعنی ''وہ (اور یہاں مثنوی کے فاضل مترجم قاضی سجاد حسین صاحب نے بریکٹ میں ''رُوح'' درج کردیا ہے، جو ہماری بیان کردہ تفاصیل کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ رُوح تو عالمِ اَمر کی شے ہے جس پر نہ کوئی تنزل واقع ہوا ہے' نہ ہی وہ کسی عمل ارتقاء سے ہوکر گزری ہے —— بلکہ یہ سارا سفر جو آگے بیان ہورہا ہے ''مادہ'' کا ہے کہ وہ) اوّلاً جمادات کے عالم میں وارد ہوا' پھر عالمِ جمادات سے عالمِ نباتات میں درآیا۔ اور سالہا سال عالمِ نباتات میں گزارنے کے دوران اسے کبھی عالمِ جمادات کی کوئی بات یاد نہ آئی۔ پھر جب وہ عالمِ نباتات سے عالمِ حیوانات میں داخل ہوا تو اسی طرح اسے عالمِ نباتات میں گزارے ہوئے دور کی کوئی بات یاد نہ رہی —— پھر اسے عالمِ حیوانات سے اس ''خالق'' نے جسے تم خوب جانتے ہو عالمِ انسانیت کی طرف کھینچ لیا —— اور اس طرح وہ ایک عالم سے دوسرے عالم تک سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا کہ صاحب عقل و دانش اور دانا و بینا بن گیا''۔

عہدِ حاضر کے ''ترجمان القرآن'' اور ''رومیٔ ثانی'' علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں جس رفعت فکر اور نزاکت خیال کے ساتھ نہ صرف نفس ارتقاء بلکہ اس کے سبب اور نقطۂ آغاز' اور اس کے منتہاء اور منزلِ مقصود کو بیان کیا ہے' واقعہ یہ ہے کہ عقولِ متوسطہ کے حامل لوگوں کے لئے تو اس کا فہم وادراک مشکل ہی نہیں محال ہے —— غنیمت ہے کہ ''حکمت اقبال'' کے شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور نے اپنے اس مقالہ کے ذریعے اسے کسی قدر آسان بنادیا ہے جو مجلّہ ''اقبال ریویو'' کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے مولانا رومیؒ کے متذکرہ بالا اشعار کے عین مطابق ارتقاء کے طویل سفر کے تین مراحل قرار دیئے ہیں' یعنی: اوّلاً طبیعیاتی اور کیمیاوی ارتقاء' ثانیًا حیاتیاتی ارتقاء' اور ثالثًا نظریاتی یا تصوراتی ارتقاء —— گویا ایجاد و ابداع کے مراتب نزول کے مرتبۂ ثانی کے آغاز کے ساتھ ہی ارتقاء کا اوّلین مرحلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ یعنی (Big Bang) کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتہائی چھوٹے ''ذرات'' (Particles) کے مابین تالیف و ترتیب سے اوّلاً ایٹم وجود میں آئے اور پھر ان ایٹموں کے اجتماع سے سالمات یعنی ''مالی کیولز'' (Molecules) بنے —— اور پھر ان ''سالمات'' کے مابین جمع و تدوین سے اوّلاً غیر نامیاتی مرکبات (Inorganic Compounds) اور بالآخر نامیاتی مرکبات (Organic Compounds) وجود میں آئے' جن پر سفر ارتقاء کے اس مرحلہ اوّل کی تکمیل ہو گئی —— واضح رہے کہ اسی مرحلے کو ہم اس سے قبل مراتب نزول کے تیسرے مرحلے کی تکمیل قرار دے چکے ہیں' جس کی نہایت حسین اور حد درجہ بلیغ تعبیر مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے ان الفاظ سے کی کہ ''ہر دو عالم خاک شد!'' لیکن چونکہ مراتب نزول کا یہ مرتبۂ ثالث ہی ارتقاء کا مرحلہ اوّل بھی تھا لہٰذا اس کے بعد ہی ارتقاء کے دوسرے مرحلے یعنی حیاتیاتی ارتقاء کا آغاز ہوا۔ اور چونکہ اس کی تکمیل ہونی تھی انسان کی تخلیق پر لہٰذا اس کے آغاز کو بیدل نے ''تا بست نقش آدمی!'' سے تعبیر کیا۔

ماہرینِ علومِ طبیعی نہ تو تا حال اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے ہیں کہ ''عالمِ جمادات'' سے تعلق رکھنے والے کیمیاوی مرکبات میں ''حیات'' کی نمود کس طرح سے ہوئی' نہ ہی یہ ان کے لئے کبھی آئندہ ممکن ہو گا —— اس لئے کہ اس کا تعلق پھر اُسی عالمِ اَمر سے ہے جو طبیعیات کے دائرۂ تحقیق و تفتیش سے باہر ہے —— یعنی اللہ کا ایک اور امر ''کُن''! جس کے ذریعے مُردہ مادے میں ''حیات'' کا کرنٹ (Current) دوڑنا شروع ہو گیا۔

بہر حال اس کے بعد سفر ارتقاء کی دوسری منزل یعنی حیاتیاتی ارتقاء کا طویل عمل شروع ہوا' جس کے ضمن میں یہ امر تو اب پوری دُنیا میں متفق علیہ ہے کہ اوّلاً حیاتِ ارضی کی نہایت حقیر اور سادہ صورتیں ظہور میں آئیں —— اور پھر وقتاً فوقتاً درجہ بدرجہ کمتر سے برتر' اور کہتر

سے بہتر صورتیں ظہور میں آتی چلی گئیں —— لیکن یہاں پہلا مسئلہ تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کم تر کے بعد برتر ''انواع'' کا ظہور محض ایک زمانی ترتیب کا مظہر ہے' یعنی ہر نئی نوع سابقہ کم تر نوع سے بالکل آزاد اور غیر متعلق طور پر براہِ راست اپنی مخصوص صورت میں پردۂ عدم سے براہِ راست عالمِ وجود میں آتی رہی یا ہر بعد میں آنے والی نوع پہلے سے موجود نوع ہی میں کسی قدر تبدیلی سے وجود میں آئی؟ —— تو جہاں تک خالقِ ارض و سماوات اور مُوجدِ کون و مکان سبحانہٗ و تعالیٰ کا تعلق ہے اسے یقیناً یہ قدرت اور وسعت حاصل ہے کہ وہ ہر مخلوق کو جس صورت میں بھی وہ تھی' یا ہے' یا ہو گی جداگانہ طور پر براہِ راست عدم سے وجود میں لے آئے —— لیکن اس کی سنّت و عادت یہ ہے کہ وہ کسی بھی شے کو پیدا کر کے اس کے لئے کچھ قواعد و قوانین معین کر دیتا ہے —— جو اس شے کی ''تقدیر'' بن جاتی ہیں (بفحوائے: ﴿خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾ [1] (الفرقان:۲) اور ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى o وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى﴾ [2] (الاعلیٰ:۲'۳) —— پھر وہ ان ہی قواعد و قوانین کے مطابق اسے چلنے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی مشیت متقاضی ہوتی ہے اس میں اپنے کلمہ ''کُن'' کے ذریعے کوئی جزوی تبدیلی پیدا کر کے ایک نئی مخلوق کی صورت عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اوّلاً تو ''خلق'' اصلاً نام ہی اس کا ہے کہ کسی پہلے سے موجود شے سے کوئی دوسری شے پیدا کر دی جائے! (بمقابلہ ابداع و ایجاد —— جو عدم محض سے وجود میں آنے سے عبارت ہے!) اور ثانیاً قرائن کی شہادتوں اور قرآن حکیم کے اشارات سے اسی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق کی طرح حیاتِ ارضی کے ارتقاء نے بھی یہی صورت اختیار کی ہے!

لہٰذا اس معاملے میں ان لوگوں کیلئے تو کوئی مشکل ہے ہی نہیں جو ایک مُبدع و مُوجد اور ''اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ'' ہستی پر یقین رکھتے ہیں —— ان کے نزدیک تو یہ سارا سفر تنزل و ارتقاء اسی کی مشیت و تدبیر' اور اسی کے حکم و امر کا ظہور ہے۔ جیسے کہ حکیم اسلام مولانا رومؒ نے نہایت سادہ الفاظ میں فرمایا کہ ؏ ''می کشد آں خالقے کہ دانیش!'' یعنی یہ

---

(۱) ''اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی''۔

(۲) ''جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ اور جس نے اندازہ ٹھہرایا' پھر راہ معین کی''۔

سارے فاصلے اُسی خالق نے طے کرائے ہیں جس سے تم بخوبی واقف ہو! (اس لئے کہ ان کے مخاطبِ اوّلین وہ مسلمان ہی تھے جو خالق ارض وسماوات پر ایمان رکھتے ہیں!)

البتہ وہ مادہ پرست جو اس مُبدع ومُوجد اور خالق و باری ہستی کو ذہن وخیال سے دُور رکھتے ہوئے اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حیاتِ ارضی کی کمتر سے برتر اور کہتر سے بہتر کی طرف چھلانگ کس طور سے لگی اور اس کا ''میکا نزم'' کیا تھا وہ شدید مشکل سے دوچار ہوگئے ہیں۔

چنانچہ ان کے سرخیل تو ہیں جناب ڈارون جنہوں نے اس کی خالص مادی اور انفعالی توجیہہ کی ہے —— یعنی یہ کہ ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگی (Adaptation) اختیار کرنے اور وسائل زندگی کی محدودیت کی بناء پر ان کے ضمن میں کشاکش اور ''تنازع للبقاء'' (Struggle for Existence) کے نتیجے میں حیوانات کے جسمانی اور عضویاتی نظام میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں' جو تدریجاً بڑھتے بڑھتے اور نسلاً بعد نسل وراثت میں منتقل ہوتے رہنے سے ایک بالکل نئی نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہیں —— نتیجتاً جو نوع اپنے ماحول سے زیادہ سے زیادہ مطابقت پیدا کرلیتی ہے وہی پھلتی اور پھیلتی ہے —— باقی انواع یا تو نابود ہوجاتی ہیں —— یا عمل ارتقاء کی نچلی منزلوں پر ''مقیم'' ہوجاتی ہیں! —— ڈارون کے اس نظریئے کے تسلیم کئے جانے میں اہم ترین مانع اور کانٹے کی رکاوٹ تو یہ رہی کہ حیوانات ماحول کے زیر اثر جو نئے اوصاف (Acquired Characters) اختیار کرتے ہیں' ان کے تناسل وتوارث کے ذریعے اگلی نسل کو منتقل ہونے کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکا —— اس کے باوجود محض اس لئے کہ نفس ارتقاء کا معاملہ بدیہیات کے زمرے میں داخل ہوگیا تھا' ڈارون کی اس خالص مادی اور انفعالی توجیہہ کو فکر انسانی کے تمام دائروں میں اثر ونفوذ حاصل ہوگیا —— جس کا نمایاں ترین مظہر یہ ہے کہ فلسفۂ مادیت کو منطقی انتہا تک پہنچانے والا مفکر کارل مارکس اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''داس کیپٹال'' کو ڈارون ہی کے نام سے معنون کرنا چاہتا تھا۔ (اس ضمن میں اس واقعے کا ذکر دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مارکس کے دوست اور رفیق کار انجلز نے

اسے خط لکھا تھا کہ میں آج کل چارلس ڈارون کی کتاب پڑھ رہا ہوں' جو بہت ہی عمدہ ہے۔ اس لئے کہ اس نے مذہب کے آخری قلعے کو بھی مسمار کر دیا ہے' جس پر خود کارل مارکس نے بھی ڈارون کی کتاب کا مطالعہ کیا اور انجلز کے خیال سے اتفاق کا اظہار کیا۔)

تاہم جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے ہے خالص علم الحیات (Biology) کے میدان میں ڈارون کی یہ توجیہہ ارتقاء غیر مقبول ہوتے ہوتے تقریباً دم توڑ چکی ہے —— اور اس کی بجائے لامارک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا یہ مثبت نظریہ زیادہ قبولیت حاصل کر رہا ہے کہ ارتقاء کے اس سفر کا اصل محرک ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا انفعالی ردعمل نہیں بلکہ ''حیات'' میں یہ داخلی اور اساسی طور پر موجود (inherent) جذبہ اور ولولہ ہے کہ وہ ازخود ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!'' کے انداز میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ گویا یہ تبدیلی اندھے بہرے مادے کے محض حادثاتی عمل اور ردعمل کا مظہر نہیں بلکہ اس کی پشت پر ایک واضح مقصدیت کارفرما ہے! (چنانچہ اس نظریئے کو علم الحیات کی اصطلاح میں (Purposeful and Teleological Evolution) کہا جاتا ہے' جو حقیقتِ نفس الامری سے نسبتاً قریب تر ہے!)۔

مزید برآں علم الحیات (Biology) کے میدان میں ڈارون کے بعد کے اکتشافات سے یہ حتمی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تبدیلی اصلاً Genes یا DNA میں واقع ہوتی ہے —— گویا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں والد کی جانب سے آنے والے sperm کی کمی کو پورا کیا تھا اللہ تعالیٰ کے ایک کلمۂ ''کن'' نے' اسی طرح ذاتِ خالق و باری ومصور نے جب چاہا اپنے امر ''کُن'' سے حیوانات کی کسی بھی نوع کے Genes میں تبدیلی پیدا کردی —— اور اس طرح ایک نئی نوع وجود میں آگئی!

اور یہ سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ''حیوانِ انسان'' یعنی بیالوجی کی اصطلاح میں "Homo Sapiens" کے ظہور پر سفر ارتقاء کا یہ دوسرا مرحلہ تکمیل کو پہنچ کر اختتام پذیر ہوگیا!

تکمیلِ تخلیقِ آدمؑ ___ اور ___ عطاءِ خلعتِ خلافت

اوراس کے بعد پیش آیا تاریخِ کائنات کا عظیم ترین واقعہ یعنی ''حیوانِ انسان'' میں نفخ روحِ آدمؑ ___ اوراس طرح وجود میں آنے والے حضرت آدم علیہ السلام کو تفویضِ خلافتِ ارضی ___ اوراس کے لئے منعقد ہونے والے ''جشنِ تاجپوشی'' میں جملہ کارکنانِ قضا و قدر یعنی تمام ملائکہ کا بطورِ اظہارِ تسلیم وانقیاد ''خلیفة اللّٰہ'' کے سامنے سجدہ ___ لیکن ملائکہ کے طبقہ اسفل میں شامل جِنّ عزازیل کا اعلانِ بغاوت' اور نتیجتاً راندۂ درگاہِ رب قرار پانا۔ اور شیطان اور ابلیس کے خطابات سے نوازا جانا!

حکمت و فلسفۂ قرآن کی رو سے قصۂ آدم و ابلیس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن میں سات مرتبہ وارد ہوا ___ چھ بار مکی سورتوں میں' اور ایک مرتبہ مدنی سورت (البقرہ) میں۔ پھر مکی سورتوں کے چھ مقامات جن میں یہ واقعہ مذکور ہے مصحف میں حیرت انگیز توازن و تقابل (symmetry) کے ساتھ واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ مصحف کے عین وسط میں واقع ہیں فلسفہ و حکمت قرآنی کے دو عظیم ترین خزانے یعنی سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف ___ جو سورتوں کے نہایت حسین و جمیل اور حد درجہ متوازن و متناسب جوڑے کی صورت میں ہیں' اس لئے کہ دونوں ہی بارہ بارہ رکوعوں پر مشتمل ہیں اور آیات کی تعداد بھی تقریباً برابر (۱۱۱ اور ۱۱۰) ہے! ___ اور مزید حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان دونوں ہی کے ساتویں رکوع کے آغاز میں مذکور ہے یہ قصۂ آدم و ابلیس! ___ پھر سورۂ بنی اسرائیل سے پیچھے کی جانب مڑیئے تو ایک سورة (النحل) چھوڑ کر سورة الحجر میں یہ واقعہ مذکور ہے تو دوسری جانب سورۂ کہف سے آگے بڑھئے تو ایک سورت (مریمؑ) چھوڑ کر سورۂ طٰہٰ میں اس کا ذکر موجود ہے ___ پھر سورة الحجر سے چھ پارے پیچھے ہٹئے تو سورة الاعراف میں' اور ادھر سورۂ طٰہٰ سے سات پارے آگے جائیں تو سورۂ ص میں یہ قصہ وارد ہوا ہے ___ اور پھر ترتیب نزول کے اعتبار سے ان سب کے بعد یہ قِصّہ سورة البقرہ میں ایک اہم اضافے یعنی آدمؑ کو خلافتِ ارضی عطا کئے جانے کے ذکر کے ساتھ مذکور ہے ___ اس لئے کہ اس سورۂ

مبارکہ کے نزول کے وقت سرزمین یثرب میں عرصۂ دراز کے بعد از سرِ نو ''خلافتِ الٰہی'' کے بالفعل قیام کا آغاز ہو گیا تھا!

متذکرہ بالا سات مقامات میں سے دو مقامات (سورة الحجر اور سورۂ ص) اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان میں حضرت آدمؑ کے ذکر سے قبل ''بشر'' کی تخلیق اور تسویہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ سورۂ ص میں فرمایا گیا ﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ﴾ [۱] (آیت:۷۱) اور سورة الحجر میں فرمایا گیا ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ [۲] (آیت:۲۸) ___ گویا ان دونوں مقامات پر اولاً ع ''ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی!'' کے مصداق انسان (بشر) کی تخلیق کے لئے قرآن میں جو چھ اصطلاحات وارد ہوئی ہیں یعنی تُراب' پھر طِین' پھر طِیْنٍ لَّازِبٍ' پھر حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' پھر صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ' اور بالآخر صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ___ ان میں سے سورۂ ص میں ابتداء سے دوسری اصطلاح کا ذکر ہے ___ اور سورة الحجر میں آخری سے پہلی والی اصطلاح مذکور ہے!) ___ اور ثانیاً اس کے بعد ان دونوں سورتوں میں دو دو آیات بعینہٖ ایک جیسے الفاظ میں وارد ہوئی ہیں' یعنی ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ o فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ [۳] (الحجر:۲۹'۳۰ اور ص:۷۲'۷۳) ___ ان دونوں مقامات پر ''تسویہ'' کی اصطلاح میں سمو لیا گیا ہے پورا عمل ارتقاءِ حیاتِ ارضی' جو منتج ہوا ''حیوانِ انسان'' کے ظہور پر' اس کے بعد ذکر ہوا اُس حیوانِ انسان میں رُوحِ آدم کے پھونکے جانے کا ___ جو اُس وقت تک مخزنِ ارواح میں محوِ خواب تھی ___ اور جس کے عز و شرف کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا ___ یعنی ''مِنْ

(۱) ''جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں''۔

(۲) ''اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں''۔

(۳) ''پھر جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا! چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا''

"رُّوْحِیْ" —— اور اس طرح وجود میں آئے حضرت آدمؑ جن کو سجدہ کرنے کا حکم جملہ ملائکہ کو دے دیا گیا! جنہوں نے بلا حیل وحجت اور بغیر پس و پیش آنِ واحد میں تعمیل حکم میں سر جھکا دیئے' اس لئے کہ ان کی شان ہی یہ ہے کہ ﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ (۱) (التحریم:۶) —— جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے ملائکہ کا یہ سجدہ علامت یا symbol تھا ان کے حضرت آدم کو "خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ" تسلیم کر کے ان کے سامنے اطاعت و انقیاد کے اقرار کا —— اور یہ گویا "جشن تاجپوشی" تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کو خلعتِ خلافت عطا ہونے پر منعقد کیا گیا۔

ابلیس کا اعلانِ بغاوت اور اس کا سبب

قرآن مجید کے متذکرہ بالا ساتوں مقامات پر جملہ ملائکہ کے حضرت آدمؑ کو سجدہ کر لینے کے ذکر کے معاً بعد الفاظ وارد ہوئے ہیں ﴿اِلَّآ اِبْلِیْسَ﴾ اور پھر مختلف مقامات پر مختلف الفاظ ملتے ہیں' جیسے: سورۃ البقرۃ آیت ۳۴ میں ﴿اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۲) —— سورۃ الاعراف آیت ۱۱ میں ﴿لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ﴾ (۳) —— سورۃ الحجر آیت ۳۱ میں ﴿اَبٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ﴾ (۴) —— سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶۱ میں ﴿قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا﴾ (۵) —— سورۂ کہف آیت ۵۰ میں ﴿کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ﴾ (۶) —— سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۶ میں صرف "اَبٰی" اور سورۂ ص آیت ۷۴ میں ﴿اِسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۷) (گویا

(۱) "وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں"۔
(۲) "اس نے انکار کیا، وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا"۔
(۳) "وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا"۔
(۴) "اس نے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ دینے سے انکار کر دیا"۔
(۵) "اس نے کہا: کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟"
(۶) "وہ جنوں میں سے تھا اس لئے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا"۔
(۷) "اس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا"۔

سورۃ البقرۃ میں سورۂ طٰہٰ اور سورۂ ص میں وارد شدہ الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں!)

یہاں اس سوال کے دو جواب ممکن ہیں کہ جب حکم سجدہ فرشتوں کو دیا گیا تھا تو عزازیل نامی جن اس کا مخاطب کیسے قرار پایا؟ —— یعنی ایک یہ کہ حکم الٰہی ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (۱) فرشتوں اور جنات دونوں کو تھا لیکن ذکر برسبیلِ تغلیب صرف فرشتوں کا کیا گیا —— اور دوسرا یہ کہ' جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' عزازیل اپنے علم اور زہد و طاعت کی بنا پر ملائکہ کے طبقۂ اسفل میں شامل ہو گیا تھا —— واللہ اعلم!

البتہ اصل لائق توجہ امر یہ ہے کہ خود ابلیس نے اپنے انکار و بغاوت کا سبب کیا بیان کیا —— سورۃ البقرہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے —— سورۃ الاعراف میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ج خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ (۲) (آیت ۱۲)۔ سورۃ الحجر میں یہ قول وارد ہوا ﴿قَالَ لَمْ اَکُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَہٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ (۳) (آیت ۳۲) —— سورۂ بنی اسرائیل میں وارد شدہ الفاظ پہلے ہی درج کئے جا چکے ہیں' یعنی ﴿قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا﴾ —— سورۂ کہف اور سورۂ طٰہٰ میں بھی اس کا کوئی قول مذکور نہیں —— البتہ سورۂ ص میں دوبارہ بعینہٖ وہی الفاظ وارد ہوئے ہیں جو سورۃ الاعراف میں ہوئے تھے یعنی ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ج خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ (آیت ۱۲)۔

اس پوری تفصیل کے بیان سے غرض یہ ہے کہ یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جائے کہ ابلیس کی بغاوت کا اصل سبب یہ تھا کہ اس کے سامنے حضرت آدمؑ کی شخصیت کا صرف وہ حیوانی پہلو تھا جو خاکی الاصل ہونے کے ناطے مرتبہ و مقام کے اعتبار سے ناری الاصل جنات کے مقابلے میں کمتر تھا —— اور یہ اس لئے کہ چونکہ ابلیس کا تعلق بھی حیوانِ انسان کی مانند عالمِ خلق سے تھا لہٰذا حیوانِ انسان سے تو وہ بخوبی واقف تھا —— لیکن رُوحِ آدمؑ

(۱) "سجدہ کرو آدم کو"۔
(۲) "میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے"۔
(۳) "اس نے کہا: میرا یہ کام نہیں کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے"۔

کا تعلق چونکہ عالمِ اَمر اور اس کے بھی طبقۂ اعلیٰ سے تھا جس تک جنات کے علم وادراک کی رسائی ہی نہیں تھی لہٰذا وہ اس سے ناواقف اور ''محجوبِ محض'' تھا۔ جبکہ —— آدمؑ کے عزّ و شرف کی اصل بنیاد اور انہیں خلافتِ ارضی کا اہل اور مسجودِ ملائک بنانے والی اصل شے ہی وہ رُوحِ ربّانی تھی جو ان کے حیوانی جسد میں پھونکی گئی —— اور جسے خالق کائنات نے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا! بفحوائے ﴿فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ﴾ (۱) (الحجر:۲۹ اور ص:۷۲) —— گویا ابلیس کی گمراہی اور بغاوت کا اصل سبب یہ تھا کہ آدمؑ کی مرکب شخصیت' جو دو اجزاء کے جمع ہونے سے وجود میں آئی تھی' یعنی ایک حیوانی وجود جس کا تعلق ''عالمِ خلق'' سے تھا' اور دوسرے روحانی وجود جس کا تعلق ''عالمِ اَمر'' سے تھا' ان میں سے حیوانی وجود تو اس کے سامنے تھا' لیکن روحانی وجود سے وہ ''محجوب'' تھا! (اور غالباً یہی حقیقت ہے جس کی جانب اشارہ ہوا ہے اس فرمانِ الٰہی میں کہ ﴿خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ﴾ میں نے اس آدم کو اپنے ''دونوں ہاتھوں'' سے بنایا ہے —— اور جس کی سادہ ترین تعبیر شیخ سعدیؒ کے اس شعر میں ہے کہ ع

''آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں''

اور بعینہٖ یہی سبب ہے عہد حاضر کی اس عالمی ضلالت وشیطنت کا جو مادہ پرستانہ نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کے غلبہ واستیلاء کی بنا پر پورے عالمِ انسانی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے —— اور جسے دو آتشہ یا سہ آتشہ ہی نہیں صد آتشہ کر دیا ہے نظریۂ ارتقاء کی جملہ سائنسی تعبیرات نے' جن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بس نسبتاً زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں! —— اس لئے کہ ٹھیک عزازیل ہی کے مانند علومِ طبیعی (Physical Sciences) بھی رُوح اور روحانیت سے محجوب ہونے کے باعث انسان کے صرف حیوانی وجود ہی سے بحث کر سکتے ہیں' رہے ''عالمِ اَمر'' کے معاملات یا بالفاظِ دیگر ''مابعد

(۱) ''پھر جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا''۔

الطبیعیات'' تو وہ ان کے دائرہ تحقیق وتفتیش سے خارج اور ماوراء ہیں!

بہر حال' اسی ''یک رخنے'' علم نے اُس ''یک رخنے'' اور خالص مادہ پرستانہ فکر یعنی (Scientism) کو جنم دیا —— جس سے موجودہ ''یک چشمی'' دجالی تہذیب وجود میں آئی ہے' جو خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی اور رُوح اور رُوحانیت سے بیگانہ ونابلد محض ہے —— اور جو آج نوعِ انسانی کی عظیم اکثریت میں اس درجہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ نفوذ کر چکی ہے' کہ مشرق ومغرب کے عوام الناس ہی نہیں' عہد حاضر کے بیشتر مسلم سکالر اور دانشور حتیٰ کہ داعیانِ تحاریک اسلامی بھی ''رُوح'' کے آزاد اور جداگانہ تشخص ووجود سے منکر ہیں —— اور اسے صرف حیات یا زندگی یا ''جان'' کے مترادف خیال کرتے ہیں —— فوا حسرتاً ویا اسفاً!!

ابلیس کی انسان دشمنی' اور معرکۂ خیر وشر

قرآن حکیم میں سات مقامات پر دہرائے جانے والے قِصّہ آدم وابلیس کا آخری حصّہ اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے عالمِ انسانیت میں خیر وشر اور حق و باطل کے مابین جو کشاکش ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

کے انداز میں جاری ہے' اس کے ایک اہم عامل کی نشاندہی ہوتی ہے! یعنی ابلیس لعین کی آدمؑ اور ان کی ذریت سے بغض وعداوت —— اور اس کی بنا پر انسانوں کے اغوا اور اضلال میں ایک طاقتور غیر مرئی قوت کی کارفرمائی۔

ابلیس لعین نے اپنی بغاوت اور سرکشی پر راندۂ درگاہِ حق ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی عمر کے قیامت تک دراز کئے جانے کی درخواست کی' جو منظور ہو گئی۔ تب اس نے نہایت متکبرانہ اور متحدیانہ انداز میں آدمؑ اور اس کی ذُریت کے خلاف اپنی عداوت کا برملا اظہار اور دائمی جنگ کا کھلا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سات مقامات میں سے تین پر تو اس بغض وعداوت کا

ذکر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا ہے' جیسے

(۱) سورۃ البقرہ میں ﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۱) (آیت ۳۶) کے الفاظ میں'

(۲) سورۂ طٰہٰ میں ابتداءً ﴿فَقُلْنَا يٰآدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ﴾ (۲) (آیت ۱۱۷) کے الفاظ میں اور بعد ازاں بالکل سورۃ البقرہ میں وارد شدہ الفاظ سے مماثل الفاظ میں یعنی ﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۳) (آیت ۱۲۳) اور

(۳) سورۂ کہف میں ذریت آدمؑ سے اللہ تعالیٰ کے شکوے کے انداز میں کہ ﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ط بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا﴾ (۴) (آیت ۵۰)۔

البتہ بقیہ مقامات پر شیطانِ لعین کی جانب سے بھرپور چیلنج کے انداز میں کھلی جنگ کا اعلان سامنے آتا ہے' جیسے

(۱) سورۂ بنی اسرائیل میں ﴿لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (۵) (آیت ۶۲) کے الفاظ میں

(۲) سورۂ ص میں ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۶) (آیات ۸۲'۸۳) کے الفاظ میں' اور

---

(۱) ''اور ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو''۔

(۲) ''چنانچہ ہم نے آدم سے کہا: دیکھو' یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے''۔

(۳) ''فرمایا: تم دونوں (فریق' یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے''۔

(۴) ''اب کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ بڑا ہی برا بدل ہے جسے ظالم لوگ اختیار کر رہے ہیں''۔

(۵) ''میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں گا' بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے''۔

(۶) ''اس نے کہا: تیری عزت کی قسم' میں ان سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا' بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہے''۔

(۳) سورۃ الحجر میں ﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (۱) (آیات ۳۹'۴۰) کے الفاظ میں' —— اور سب سے زیادہ مفصل سورۃ الاعراف میں ﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (۲) (آیات ۱۶'۱۷) کے الفاظ میں!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انسان کی شخصیت کے داخلی محاذ پر تو جو معرکہ خیر و شر برپا ہوتا ہے اس کی اساس اس کے اپنے وجود کے دو اجزائے ترکیبی ہیں' یعنی ایک جانب اس کا وجودِ حیوانی ہے جو اپنے اُن خالص جبلی تقاضوں (Instincts) اور شہوانی امنگوں (Lusts) کے زیر اثر اسے شر اور سوء کی جانب کھینچتا ہے جنہیں صرف اپنی تسکین (Gratification) ہی سے غرض ہوتی ہے' قطع نظر اس سے کہ اس کے ذرائع جائز ہوں یا ناجائز' بفحوائے ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (۳) (یوسف: ۵۳) تو دوسری جانب وہ رُوح ہے جو اسے ع

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

کے انداز میں برائی سے روکتی اور اس پر ملامت کرتی ہے (چنانچہ اس حال میں ''نَفْسِ لَوَّامَةٌ'' کہلاتی ہے) اور اس کے برعکس خیر کی جانب راغب کرتی ہے —— لیکن خارجی

---

(۱) ''وہ بولا: میرے رب' جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لئے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا' سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو''۔

(۲) ''بولا: اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ پھر میں آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا' اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا''۔

(۳) ''نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔

محاذ پر جو اصل ہنگامۂ کشاکش اور گرمیٔ ستیز خیر و شر کے مابین انسانی معاشرے میں برپا ہے‘ اس کے ضمن میں دو دو داعیانِ خیر ہیں تو دو دو ہی داعیانِ شر بھی موجود ہیں —— ایک ایک مرئی اور محسوس و مشہود یعنی خود انسانوں ہی میں سے داعیان اِلی الخیر اور داعیان اِلی الشر‘ اور ایک ایک غیر مرئی‘ یعنی ایک جانب ملائکہ جو نیکوکاروں کی تقویت کے موجب بنتے ہیں اور دوسری جانب ابلیس لعین اور اس کی ذریت صلبی و معنوی جو شیاطین کا رول اختیار کر کے انسانوں کی گمراہی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیثِ نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کی حیاتِ دنیوی کو اس کے لئے ایک امتحانی وقفہ قرار دیا ہے —— اور اسی لئے اسے اس رزم گاہ خیر و شر میں ع ’’درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ!‘‘ کے انداز میں داخل کر دیا ہے‘ لہٰذا ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان کو بھی لگا دیا ہے تاکہ انسان اس کی تمام تر تحریص و ترغیب شر اور جملہ وسوسہ اندازیوں کے علی الرغم توحید نظری و عملی کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہ کر اپنے شرفِ انسانیت کا ثبوت فراہم کرے!

ابلیس لعین اور جنات میں سے اس کی ذریت صلبی و معنوی کو انسانوں کے مقابلے میں ایک سہولت تو یہ حاصل ہے کہ وہ غیر مرئی ہونے کی بنا پر انسان پر وہاں سے حملہ کرتے ہیں جہاں سے انسان انہیں نہیں دیکھ سکتے‘ (بفحوائے ﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾[1] (الاعراف:۲۷) —— اور دوسری وہ جو حدیثِ نبویؐ میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ ((اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ)) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند گردش کرتا ہے۔ اب خواہ اسے ایک استعارے پر محمول کر لیا جائے یعنی اس سے یہ مراد لی جائے کہ چونکہ ان شیاطین جن کو انسانوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کی صلاحیت حاصل ہے‘ (بفحوائے ﴿اَلَّذِیْ يُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾[2] الناس:۵) جس سے وہ انسانی شہوات میں اشتعال پیدا کرتے ہیں جس کا اثر

(۱) ’’وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے‘‘۔

(۲) ’’جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے‘‘۔

انسان کے پورے وجود پر مترتب ہوتا ہے‘ تو گویا وہ اس طرح انسان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتے ہیں‘ خواہ ظاہری لفظی معنی پر محمول کر لیا جائے نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اپنے مادہ تخلیق یعنی آگ کے لطیف ہونے کی بنا پر جیسے جنات مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں‘ اسی طرح ان کا کسی دوسرے ٹھوس جسم میں حلول یا سرایت کر جانا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔)

اس کے مقابل ہے وہ تحفظ اور ضمانت جو اللہ تعالیٰ نے ان شیاطین کے اثر و نفوذ کے خلاف انسانوں کو عطا کی ہے۔ یعنی جو لوگ اخلاص کے ساتھ اللّٰہ کے بندے بن جائیں ان پر شیاطین کا کوئی داؤ یا وار کارگر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسانوں میں سے صرف وہ لوگ ان کے ہتھے چڑھتے ہیں جو خود اپنی داخلی شخصیت کے محاذ پر رُوحِ ربّانی کی بجائے نفس امارہ کی اطاعت و اتباع کی روش اختیار کر چکے ہوں۔ جیسے کہ سورۃ الحجر میں وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آغاز ہی میں ابلیس سے کہہ دیا تھا کہ ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾[1] (آیت ۴۲) (سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۵ میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے۔) مزید برآں دو بار یہ بھی مذکور ہے کہ خود شیطانِ لعین نے بھی آدمؑ اور ان کی ذریت کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہوئے تسلیم کر لیا تھا کہ اللہ کے ان مخلص بندوں پر‘ جو اپنے اخلاص للہ کے قبول کئے جانے کی بنا پر ’’مخلص‘‘ ہو جائیں گے ان پر میرا کوئی داؤ یا وار کارگر نہیں ہو گا! (سورۂ ص:۸۳‘ اور سورۃ الحجر:۴۰)۔

نسل انسانی کی تاریخ میں جب تک انفرادیت کا پلڑا اجتماعیت پر بھاری رہا‘ خیر و شر کی یہ کشاکش بھی افراد ہی کے داخلی اور خارجی محاذوں پر جاری رہی —— لیکن اب سے دو ڈھائی سو برس قبل جب ایک جانب انسان میں ’’خود شناسی و خودنگری‘‘ یعنی اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا‘ اور دوسری جانب مشینوں کی ایجاد نے صنعتی انقلاب کی داغ بیل ڈالی‘ اور تیسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں برق رفتار ترقی کا آغاز ہوا‘ جس کے

(۱) ’’بے شک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا‘ لیکن (تیرا بس تو) صرف ان بہکے ہوئے لوگوں پر ہی چلے گا جو تیری پیروی کریں‘‘۔

نتیجے میں آج یہ صورت ہے کہ بقولِ علامہ اقبال ۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!

تو شیطان لعین نے بھی اپنی عظیم منصوبہ بندی کے ساتھ انسانوں ہی میں سے اپنے ہتھیائے ہوئے ایجنٹوں کے ذریعے سماجی' معاشی اور سیاسی تینوں میدانوں میں بے اعتدالی' بے راہ روی' اور فکری و عملی گمراہی کی صورت میں شر کا اثر و نفوذ حیاتِ اجتماعی کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا —— چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عالمِ انسانیت میں ع ''کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں!'' کے مصداق جو شخصیت ہر نوع کے شر اور بدی کا زہر گھولنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے' وہ ابلیس ہی کی ہے' جسے مسیحی مذہبی لٹریچر میں لوسیفر (Lucifer) کا نام دیا گیا ہے' اور جس کے ضمن میں حال ہی میں ولیم گائی کر (William Guy Kerr) نے اپنی تہلکہ آمیز تالیف "PAWNS IN THE GAME" میں یہ چشم کشا انکشافات کئے ہیں کہ اس نے انسانوں میں اپنی شیطنت کا جال اولاً سوا دو سو برس قبل "ORDER OF THE ILLUMINATI" کے ذریعے پھیلایا' پھر FREE MASONRY اور اس طرح کی دوسری تنظیموں کے ذریعے آگے بڑھایا —— اور بالآخر اب سے سو سال قبل "ELDERS OF THE ZION" کے حوالے کر دیا' جنہوں نے پہلے صرف "WASP" (White Anglo-Saxon Protestants) کے ذریعے اپنے مقاصد (اعلانِ بالفور ۱۹۱۷ء اور قیامِ اسرائیل ۱۹۴۸ء) حاصل کئے —— لیکن اب پوری عیسائی دُنیا کو اپنے فتراک کا نخچیر بنا کر نیو ورلڈ آرڈر کے عنوان سے پورے کرۂ ارضی پر بے حیائی و فحاشی' کفر و معصیت' اور شر و شیطنت کے فیصلہ کن غلبے کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں —— یہ دوسری بات ہے کہ ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [1] (آل عمران: ۵۴) کے مصداق آخری فتح حق و

(۱) ''اور انہوں نے خفیہ تدبیریں کیں تو (جواب میں) اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی، اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے''۔

صداقت ہی کی ہوگی۔ اور خیر و شر کے مابین ہونے والے اس آخری عظیم معرکے میں' جس کا نام بائبل میں ARMAGEDDON اور حدیث نبویؐ میں ''اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی'' ہے' اور جس کی کوئی جھلک علامہ اقبال نے بھی دیکھ لی تھی جب انہوں نے فرمایا تھا کہ:

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

اس میں بالآخر ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ [1] (بنی اسرائیل: ۸۱) کے مصداق حق ہی غالب آئے گا!

رحم مادر میں نسل انسانی کے ہر فرد کے ضمن میں آغازِ حیات سے تاجپوشی آدم علیہ السلام تک کے طویل سفر کا خورد بینی اعادہ!

روئے ارضی پر حیات کا آغاز ایک ایسے خورد بینی جرثومے سے ہوا تھا جو صرف ایک خلیئے (Cell) پر مشتمل تھا۔ وہاں سے حیوانِ انسان (Homo Sapiens) تک کا سفر لکھوکھا برس میں طے ہوا —— لیکن اس کے بعد نسل آدمؑ میں دوسرے حیوانات کی مانند جو سلسلۂ توالد و تناسل جاری ہوا' اس کے ضمن میں دوسرے حیوانات سے بالکل جداگانہ اور ممیّز مرحلہ وہ آتا ہے جب رحم مادر میں پرورش پانے والے ابنِ آدم کے ہر جنین (Embryo) کی آدمؑ ہی کی طرح ''تاجپوشی'' ہوتی ہے' اور اس میں بھی اس کی وہ ''رُوح'' لا کر پھونک دی جاتی ہے' جو اس وقت تک ''مخزنِ ارواح'' میں محوِ خواب تھی!

قرآن حکیم میں علم جنین (Embryology) کے جو حوالے آئے ہیں' انہوں نے

(۱) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو یقیناً مٹنے ہی والا ہے''۔

واقعہ یہ ہے کہ ماہرینِ علمِ جنین کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں کینیڈا کے دو ماہرینِ علمِ جنین کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر کتھ ایل مور' جن کی علمِ جنین پر دو تصانیف اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں' اور ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز' جو ٹسٹ ٹیوب بے بی کے ضمن میں شہرت یافتہ ہیں' دونوں نے نہایت متحیرانہ انداز میں گواہی دی ہے کہ قرآن حکیم نے رحمِ مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی کی ہے وہ ان معلومات کے ساتھ حیرت ناک حد تک مطابقت رکھتی ہے جو خوردبین کی ایجاد کے بعد حال ہی میں انسان کے علم میں آئی ہیں۔

قرآن حکیم میں انسانی جنین کے مدارجِ ارتقاء کے حوالے یوں تو بہت سے مقامات پر آئے ہیں لیکن بلاشبہ ان کے ذروۂ سنام کی حیثیت حاصل ہے سورۃ المومنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کو! جن میں تخلیق انسانی کو اولاً چار بڑے مراحل پر مشتمل قرار دیا گیا' جن کو کلمۂ "ثُمَّ" کے ذریعے ایک دوسرے سے متمیز کیا گیا —— پھر ان میں سے ایک یعنی تیسرے بڑے مرحلے کو چار چھوٹے مراحل میں تقسیم قرار دیا گیا' جنہیں ایک دوسرے سے متمیز کیا گیا صرف کلمہ "فَ" کے ذریعے۔ (گویا تین آیات میں تین ہی بار "ثُمَّ" وارد ہوا' اور تین ہی مرتبہ کلمہ "فَ") —— اس تمہید کے بعد غور فرمایئے کہ پہلا بڑا مرحلہ بیان ہوا ان الفاظ میں کہ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ﴾ یعنی "ہم نے پیدا کیا انسان کو گارے سے کشید شدہ خلاصے سے!" پھر دوسرا بڑا مرحلہ بیان ہوا' یعنی ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾ یعنی "پھر ہم نے اسے ایک مضبوط جائے قرار (یعنی رحم مادر کی محکم فصیل یا دیوار) میں ایک بوند کی شکل میں رکھا!" —— پھر تیسرے بڑے مرحلے کی تفصیلات آئیں جو چار چھوٹے مراحل میں منقسم ہے' یعنی ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ یعنی "پھر ہم نے اس بوند کو (جونک کی مانند) لٹکی ہوئی شکل دے دی' پھر اس لٹکی ہوئی شے کو ہم نے گوشت کے ایک (چبائے ہوئے) لوتھڑے کی صورت دے دی' پھر ہم نے اس لوتھڑے میں ہڈیاں بنا دیں' اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا" —— اور آخر میں پھر "ثُمَّ" کے فصل کے ذریعے چوتھے

اور آخری بڑے مرحلے کا ذکر فرمایا گیا ان الفاظ مبارکہ میں کہ ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ یعنی "اس کے بعد ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا کھڑا کیا!" —— اور آخر میں فرمایا ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾ —— "پس بہت ہی بابرکت ہے اللہ جو بہترین تخلیق فرمانے والا ہے!"

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ سے مراد کیا ہے؟ اس کے جواب کے لئے اپنے تعقل و تفکر یا تصور و تخیل کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے رجوع کرنا چاہئے اُس ہستی کی جانب جس کے فرائضِ منصبی میں یہ داخل ہے کہ قرآن کے اجمال کی تفصیل اور ابہام کی تبیین فرمائیں' بحوائے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ [(۱)] (النحل: ۴۴) فَصَلَّی اللّٰه علیه وعلی اٰله واصحابه وسلَّم! چنانچہ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے روایت کیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ فرمان نبوی ﷺ کہ ((اِنَّ اَحَدَكُمْ یُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً نُطْفَةً ثُمَّ یَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ یَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ یُرْسِلُ اِلَیْهِ الْمَلَكُ فَیَنْفُخُ فِیْهِ الرُّوْحَ)) یعنی "تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طور سے ہوتی ہے کہ وہ رحم مادر میں چالیس روز تک نطفہ کی صورت میں ہوتا ہے' پھر اتنی ہی مدت علقہ کی صورت میں' اور پھر اتنا ہی عرصہ مضغہ کی صورت میں' اور پھر فرشتے کو بھیجا جاتا ہے جو اس میں "رُوح" پھونک دیتا ہے!" —— گویا یہ ہے ابنِ آدم کی وہ "تاجپوشی" جس کے بعد وہ حقیقتاً "آدمی" قرار پاتا ہے۔ جبکہ اس سے قبل وہ رحم مادر میں صرف "حیوانِ انسان" کے ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا!

اب سوائے اپنے سر کو پیٹنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے اس پر کہ جدید علوم سے بے بہرہ اور علم الحیات (Biology) کی ابجد سے بھی ناواقف "علماء" ہی نہیں' اچھے بھلے جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ انسان بھی یہاں "رُوح" سے مراد زندگی یا "جان" لے لیں! جبکہ علم الحیات کی ابجد سے واقف ہر بچہ بھی جانتا ہے کہ نہ صرف وہ "نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ" جو رحم مادر

---

(۱) "اور (اے نبیؐ!) یہ ذکر آپ پر نازل کیا گیا ہے' تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جائیں جو ان کے لئے اتاری گئی ہے"۔

میں پرورش پاتا ہے' بلکہ والد کی جانب سے آنے والا جرثومہ (Sperm) اور والدہ کا بیضہ (Ovum) جن کے امتزاج سے وہ نطفۂ امشاج وجود میں آتا ہے' دونوں ''حیات'' سے پوری طرح متصف ہوتے ہیں —— بلکہ والد کی جانب سے آنے والا ''سپرم'' تو نہ صرف ''زندہ'' بلکہ بھرپور جوش و خروش کے ساتھ متحرک بھی ہوتا ہے!

نوعِ انسانی کا ذہنی اور عمرانی ارتقاء

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے جس مقالے کا ذکر اوپر آیا ہے اس میں انہوں نے تخلیق آدم کے بعد سے لے کر اب تک جاری رہنے والے دور کو نظریاتی یا تصوراتی ارتقاء (Ideological Evolution) کا دور قرار دیا ہے —— جبکہ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک ارتقاء کے اولین مرحلے یعنی خالص طبیعیاتی اور کیمیاوی ارتقاء' اور دوسرے مرحلے یعنی حیاتیاتی ارتقاء کے بعد ارتقاء کے دو مزید مراحل گزر چکے ہیں' اور تیسرا اس وقت جاری ہے!

ان میں سے پہلا مرحلہ راقم کی رائے میں ''ذہنی ارتقاء'' یعنی (Intellectual Evolution) کا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ انسان اس قابل ہو جائے کہ حقیقت الحقائق یعنی ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ' اور عظیم حقائقِ کونیہ سے ''غیب'' میں ہونے اور مادی کائنات کے زنداں میں محبوس ہو جانے کے باوجود کسی ''غیبی اطلاع'' —— یعنی وحیٔ ربّانی کے بغیر خود اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں ''آفاق میں گم شدگی'' سے ؏ ''ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں!'' کے سے انداز میں چھلانگ لگا کر نکل آئے' اور کل آفاق کو خود اپنے اندر جذب یا ''گم'' کرتے ہوئے ''منزلِ ما کبریاست!'' اور ؏ ''یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!'' کا نعرہ لگاتے ہوئے ''بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ'' اور خالق کون ومکان کو نہ صرف پہچان لے بلکہ —— ''مال و دولت دُنیا'' اور ''رشتہ و پیوند'' کے جملہ ''بتانِ وہم وگمان'' سے ناطہ توڑ کر بالکلیہ اسی کا ہو کر رہ جائے —— چنانچہ یہ تھا انسان کے ذہنی وفکری ارتقاء کا وہ مرحلۂ اوّل جس کی تکمیل ہوئی حضرت آدمؑ سے لگ بھگ پانچ ہزار برس بعد حضرت ابراہیمؑ

کی شخصیت مبارکہ پر جنہوں نے ایسے ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود جہاں ہر نوع کے شرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' چنانچہ بُت پرستی بھی تھی' اور ستارہ پرستی بھی' اور سب سے بڑھ کر ''بادشاہ پرستی'' بھی' اپنے ذاتی غور وفکر کے نتیجے میں (واضح رہے کہ سورۃ الانعام کی آیات ۷۶ تا ۷۸ کی ایک تاویل یہ بھی ہے!) یہ فیصلہ کر لیا کہ ﴿اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴾ (آیت ۷۹) یعنی: ''میں نے تو (کُل کون ومکاں اور ہر چہار سو سے منقطع ہو کر) اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا —— بالکل اسی کا ہو کر رہتے ہوئے —— اور میں ہرگز (اس کے ساتھ) شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں!'' —— چنانچہ یہی وہ توحید کامل تھی جو ان کی پوری شخصیت میں سرایت کر گئی تھی' جس کی بنا پر وہ ایک جانب ''خلیل اللّٰہ'' قرار پائے بفحوائے ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبۡرٰہِیۡمَ خَلِیۡلًا﴾ (۱) (النساء: ۱۲۵) تو دوسری جانب اپنے بعد کی پوری نسل انسانی کے امام قرار دیئے گئے' بفحوائے ﴿اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (۲) (البقرۃ: ۱۲۴) اگرچہ سب جانتے ہیں کہ انہیں اس مقام کے حصول کے لئے اپنی نظری ''توحید'' کے عملی ثبوت کے لئے ایک سے ایک بڑھ کر کڑے امتحانات اور یکے بعد دیگرے سخت سے سخت تر آزمائشوں اور ابتلاؤں میں سے گزرنا پڑا۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت پر اس ذہنی ارتقاء کی تکمیل کے بعد عمرانی ارتقاء یعنی (Social Evolution) کا مرحلہ شروع ہوا' جو عبارت ہے اس سے کہ سرمد کے اس شعر کے مصداق کہ

مُلّا گوید کہ محمدؐ بالائے آسماں رفت
سرمد گوید کہ آسماں بہ محمدؐ درشد! (۳)

---

(۱) ''اور ابراہیمؑ کو تو اللہ نے اپنا خلیل بنا لیا تھا''۔
(۲) ''میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں''۔
(۳) ترجمہ شعر: ''مُلا کہتا ہے کہ محمد ﷺ آسمان پر تشریف لے گئے' لیکن سرمد کا کہنا ہے کہ آسمان محمد ﷺ کے اندر اتر گیا''۔

وہ توحید جو حضرت ابراہیمؑ کی پوری شخصیت میں سرایت اور آنجنابؑ کے رُوئیں رُوئیں میں حلول کر کے گویا پوری طرح Internalise ہو گئی تھی' جس سے ایک فرد کی حد تک ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ''(1) کا تقاضا بتمام وکمال پورا ہو گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں صداقت اور وفا شعاری' اور حلم و تحمل کے جملہ اوصافِ عالیہ کا کامل انعکاس حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت میں ہو گیا تھا —— اب وہ Externalise ہو' اور انسانی معاشرے اور اجتماعیت میں سرایت کر کے ایک ایسی ریاست وجود میں لے آئے جس میں ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ اور ربوبیتِ عامہ پورے طور پر منعکس اور ''مشہود'' ہو جائیں اور اس طرح اس کی وہ شان بتمام وکمال ظاہر ہو جو اس کے نامِ نامی ''العدل'' اور صفت مبارکہ ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾(2) (آل عمران:18) میں بیان ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ سے قبل کے جن تین رسولوں کا ذکر بار بار آیا ہے یعنی حضرت نوحؑ' حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ —— ان کی قوموں کا صرف ایک ہی مرض بیان ہوا ہے یعنی شرک' اس لئے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس وقت تک انسانی تمدن اتنا سادہ اور فطرت سے اتنا قریب تھا کہ ابھی جنسی بے راہ روی اور معاشرتی فساد' مالی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال' اور سیاسی جبر واستبداد یا ''مستکبرین'' اور ''مستضعفین'' کی تقسیم ایسے عمرانی وتمدنی امراض پیدا ہی نہیں ہوئے تھے —— لیکن حضرت ابراہیمؑ کے زمانے ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ انسان کی ہیئتِ اجتماعی کے ان مفاسد اور امراضِ خبیثہ کا آغاز ہو جاتا ہے —— چنانچہ حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے سدوم اور عامورہ کی بستیوں کی جانب جہاں جنسی بے راہ روی (Sexual Perversion) بدترین اور مکروہ ترین صورت میں نمودار ہوئی' پھر حضرت شعیبؑ اٹھائے گئے اپنی قوم مدین یا مدیان میں' جس میں مالی لوٹ کھسوٹ کی مختلف صورتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ اور پھر حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا گیا بالخصوص فرعون اور اس کے سرداروں کی جانب جنہوں نے ایک قوم (بنی اسرائیل) پر جبر و

(1) ''اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہو جاؤ''۔
(2) ''انصاف پر قائم''۔

استبداد اور جور وظلم کی حد کر دی تھی' بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ ط اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾(1) (القصص:۳)۔

ان تینوں جلیل القدر رسولوں کے ضمن میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس اعتبار سے تو کامیابی تینوں ہی کو حاصل ہو گئی کہ تینوں کے مخالفین ومعاندین نیست ونابود کر دیئے گئے' تاہم ان کی دعوت کو اس پہلو سے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی کہ ان کی قوموں کی بحیثیت مجموعی تقدیر بدل جاتی۔ البتہ یہ کامیابی صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل ہوئی کہ انہوں نے مجبور ومقہور قوم کو غلامی اور تعذیب سے بالفعل نجات دلا دی۔ اگرچہ یہ سب کچھ ہوا معجزات اور خالص خرقِ عادت حوادث وواقعات کے ذریعے —— لیکن پھر حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے انہی بنی اسرائیل کی طرف اُس وقت جبکہ وہ اپنے دینی واخلاقی زوال کی انتہا کو پہنچ گئے تھے' اور ان کی مذہبی سیادت وقیادت' خواہ وہ احبار پر مشتمل تھی یا رھبان پر' مذہب کی بدترین Perversion کے شاہکار کی حیثیت اختیار کر چکی تھی' اور آنجنابؑ نے ان کی اس دُنیا پرستی کا پردہ چاک کیا جو مذہبیت اور دینداری کے پردے میں ہو رہی تھی' اور ان کی حقیقت ورُوحِ دین سے دوری اور بے جان رسم پرستی اور خشک قانونی موشگافیوں پر تیز وتند تنقیدیں کیں —— تو ان کے قصرِ سیادت وپیشوائیت میں تو کوئی ضعف پیدا نہ ہو سکا' الٹا انہوں نے آنجنابؑ کو اپنے بس پڑتے تو سولی پر چڑھا دیا' یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ نے ﴿وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ﴾(2) (النساء:157) کی صورت پیدا کر دی اور آنجنابؑ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا —— گویا حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام رسول معاشرتی' معاشی' اور سیاسی بے راہ روی اور

(1) ''واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' ان کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا''۔
(2) ''حالانکہ فی الواقع انہوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا' بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا''

بے اعتدالی' اورظلم وتعدی کے خلاف جہاد تو کرتے رہے لیکن انہیں کہیں کوئی عملی کامیابی حاصل نہ ہوسکی! (واضح رہے کہ حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ اول تو رسول نہیں صرف نبی تھے —— اور ثانیاً انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں جو عدل و انصاف کی جھلک دکھائی' وہ اس حکومت و اقتدار کی بنا پر تھی جو ان کی دعوت و جہاد کے نتیجے میں نہیں بلکہ محض اتفاقی یا حادثاتی انداز میں خالص وہبی طور پر عطا ہوئی تھی۔)

تاہم حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال بعد بعثت ہوئی محمد رسول اللہ ﷺ کی جنہیں اقبال نے بجا طور پر ''آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب'' قرار دیا جس کی تلاش میں ''قافلہ ہائے رنگ و بوٗ'' کو بہت دُور دراز اور طویل سفر طے کرنا پڑا —— اس لئے کہ ایجاد و ابداعِ کائنات سے لے کر تخلیق و تسویہ تک کے جملہ مراحل تنزل و ارتقاء' اور پھر ﴿قَدَّرَ فَهَدٰی﴾ [1] (الاعلیٰ:۳) کے طویل سفر کی منزل مقصود آپؐ ہی کی ذاتِ مبارکہ تھی' جس نے ''توحید'' کو بہ تمام و کمال Externalise کر کے شہنشاہِ ارض و سماوات اور جملہ مخلوقات کے پالن ہار کی حاکمیت مطلقہ اور ربوبیت عامہ پر مبنی معاشرہ اور ریاست بالفعل قائم کردی۔ یعنی زمین پر اللہ کی خلافت کا کامل نظام عملاً قائم کردیا۔ اور اس طرح نوع انسانی کے عمرانی ارتقاء کا مرحلہ اصولی اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

واضح رہے کہ اقبال کے اس مصرعے کہ ؏ ''تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے!'' کے مصداق آنحضورؐ کی ذاتِ اقدس کے ذریعے کاروانِ انسانیت اور قافلۂ انبیاء و رُسل ''دونوں'' اپنی آخری ''معراج'' کو پہنچ گئے —— قافلۂ انبیاء و رُسل اس اعتبار سے کہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ' جو خود ﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ہے' کے جاری کردہ سلسلۂ بعثتِ انبیاء و رسل اور تنزیلِ کتاب و میزان کا اصل مقصد —— یعنی ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ [2] (الحدید:۲۵) آپؐ ہی کے ذریعے پورا ہوا —— اور کاروانِ انسانیت اس اعتبار سے کہ اس نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے جو جدوجہد آپؐ نے کی وہ خالص انسانی سطح پر' سلسلۂ

---

(۱) ''اندازہ ٹھہرایا، پھر راہ معین کی''۔

(۲) ''تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔

اسباب وعلل کے حصار میں رہتے ہوئے' اور ٹھوس زمین پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے کی۔ جس سے انسان کی عظمت آشکارا ہوئی۔ اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق جو انہوں نے غالب کی شان میں کہا ہے کہ ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سعی و جہد' محنت و مشقت' ایثار و قربانی' صبر و مصابرت' اور ثبات و استقامت سے یہ حقیقت ''روشن'' اور مبرھن ہوئی کہ انسان واقعتاً خالق ارض و سما کی تخلیق کا شاہکار اور حقیقتاً اشرف المخلوقات ہے! جس میں اللہ تعالیٰ نے قوّت و صلاحیت کے اتھاہ خزانے ودیعت کئے ہیں!

الغرض' اصولی اعتبار سے ''انسانِ کامل'' اور ''رسولِ کامل'' ﷺ کے ظہور پر ایجاد و ابداع' تخلیق و تسویہ' اور تقدیر و ہدایت کا وہ طویل سفر ؏ ''شکر صد شکر کہ جمازہ بمنزل رسید'' کے مصداق اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا جو تنزلات اور ارتقاء کے طویل اور پیچ در پیچ مراحل سے گزرا تھا —— اور اب اس کا صرف ایک ضمنی مرحلہ باقی ہے' یعنی یہ کہ جو بلند چھلانگ محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانی معاشرے اور اجتماعیت کو آج سے چودہ سو سال قبل لگوائی تھی وہ ؏ ''خدارا آں کرم بارے دگر کن!'' کے مصداق دوبارہ لگے اور اس شان سے لگے کہ کُل روئے ارضی اور پورے عالمِ انسانیت کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے —— چنانچہ یہی ہے ''نوع انسانی کے عمرانی ارتقاء'' کی وہ آخری منزل جس کی جانب قافلہ انسانیت خواہی نخواہی کشاں کشاں بڑھ رہا ہے' اس حال میں کہ اس کی جھولی میں علم و حکمت اور بالخصوص اعلیٰ سماجی اقدار کی جو بھی ''خیر'' موجود ہے وہ فی الحقیقت محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی ''خیرات'' ہے' اور اس ''خیر'' کی تکمیل کی ''آرزو'' کے ضمن میں وہ اس وقت بالکل اسی طرح ''تلاشِ مصطفیٰؐ'' میں سرگرداں ہے جیسے اربوں سال قبل ''قافلہ ہائے رنگ و بوٗ'' نکلے تھے! بقول اقبال ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

چنانچہ یہ امر قطعاً شدنی اور اٹل ہے کہ ارتقائے نوعِ انسانی کی یہ آخری منزل لازماً آ کر رہے گی' اور کل روئے ارضی اور پورے عالمِ انسانیت پر وہ نظامِ عدل وقسط سایہ فگن ہو کر رہے گا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی ''رحمۃ للعالمینی'' کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اس لئے کہ متعدد صحیح اور مستند احادیث میں آنحضورؐ کی یہ صریح اور واضح پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں کہ:

۱۔ ''اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ساری زمین کو لپیٹ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لئے اور سارے مغرب بھی۔ اور (سن رکھو کہ) میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو لپیٹ کر مجھے دکھا دیئے گئے ہیں!'' (صحیح مسلمؒ عن ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ ﷺ)

۲۔ ''کُل روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر بچے گا' نہ اونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا ہوا خیمہ' جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے' خواہ وہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ ہو خواہ کمزور کی مغلوبیت کی بنا پر —— یعنی یا تو گھر اور خیمے والوں کو اللہ یہ اعزاز عطا فرمائے گا کہ وہ خود اسلام میں داخل ہو جائیں گے' یا دوسری صورت میں اللہ انہیں مغلوب فرما دے گا' چنانچہ وہ (اسلامی ریاست کی) تابعداری اختیار کر لیں گے!'' —— اس پر راوی نے کہا: ''تب وہ بات پوری ہو گی جو فرمانِ الٰہی ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [1] (الانفال:۳۹) میں وارد ہوئی ہے''۔ (مسند احمدؒ عن مقداد بن الاسودؓ)

اور خود قرآن حکیم میں وارد شدہ صغریٰ و کبریٰ کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں تین بار تو یہ الفاظِ مبارکہ ہو بہو اور جوں کے توں وارد ہوئے کہ ﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [2] (التوبہ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) گویا آنحضورؐ کا مقصد بعثت غلبۂ دینِ حق ہے —— اور پانچ مرتبہ مختلف الفاظ

(۱) ''اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لئے ہو جائے''۔

(۲) ''وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے''۔

میں ادا ہوا یہ مضمون کہ آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے' جن میں سب سے زیادہ واضح اور صریح الفاظ یہ ہیں کہ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [1] (سبا:۲۸) یعنی آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہوئی تھی —— لہٰذا منطقی طور پر آپؐ کی بعثت کا مقصد بتمام وکمال اسی وقت پورا ہو گا جب وہ صورت پیدا ہو جائے گی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان کی گئی ہے!

چنانچہ علامہ اقبال کی اس نگاہ نے جس کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ ؏ ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!'' —— مستقبل کے پردوں کو چیر کر اُس آنے والے دور کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی' جب یہ فرمایا کہ:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

البتہ دو باتیں واضح رہنی چاہئیں: ایک یہ کہ یہ سب کچھ از خود نہیں ہو جائے گا بلکہ اللہ اور محمد ﷺ پر ایمان رکھنے والوں کی اسی طرح کی جدوجہد' محنت و مشقت' ایثار و قربانی' صبر و مصابرت' ثبات و استقلال' اور سرفروشی وجانفشانی سے ہوگا جس کا نقشہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' کی پاک سیرتوں میں نظر آتا ہے اور دوسری یہ کہ اس خوشگوار اور جاں فزا منظر سے قبل موجودہ امت مسلمہ کی پیٹھ پر دین حق کے سواء السبیل اور صراطِ مستقیم سے انحراف کے باعث عذابِ الٰہی کے وہ کوڑے بھی پڑ کر رہیں گے جن کی خبریں کتب احادیث

(۱) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔

کے ابوابِ فتن، ملاحم اور اشراط الساعۃ اور علاماتِ قیامت میں دی گئی ہیں! —— تاہم اس تادیب وتعزیر کے بعد ”نورِ مصطفیٰ“ ﷺ کے بتمام وکمال ظہور و بروز کا دور آ کر رہے گا! —— اور اس کا راستہ نہ ابلیسِ لعین اور اس کے شیاطینِ جنّ و اِنس پر مشتمل لشکر روک سکیں گے، نہ ”یورپ کی مشینیں“ اور ان کی آسمان سے بات کرنے والی ٹیکنالوجی روک سکے گی!

اور یہی ارتقائے انسان کی وہ آخری منزل ہوگی جس کے بعد قیامت آ جائے گی اور وہ سلسلۂ کون ومکان جو Big Bang سے شروع ہو کر آج تک پھیل رہا ہے ﴿یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ﴾ [۱] (الانبیاء:۱۰۴) کے انداز میں لپیٹ اور سمیٹ لیا جائے گا —— اور اس کے بعد کون جان سکتا ہے کہ ﴿کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ﴾ [۲] (الرحمٰن:۲۹) کی شان رکھنے والا ”اَلۡخَالِقُ الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ“ اس ”بشکست و رواں شد!“ کی کیفیت کے بعد تکوین وتخلیق کی کونسی نئی بساط بچھائے گا! —— ہم یقین کے ساتھ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ﴿کُلُّ مَنۡ عَلَیۡھَا فَانٍ وَّیَبۡقٰی وَجۡہُ رَبِّکَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ﴾ [۳] (الرحمٰن:۲۶،۲۷)۔

وآخِرُ دعوانا اَنِ الحمد للّٰہِ رَبِّ العٰلمین!

☆ —— ☆ —— ☆

(۱) ”وہ دن جب کہ ہم آسمان کو یوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے“۔

(۲) ”ہر آن وہ نئی شان میں ہے“۔

(۳) ”ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل وکریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے“۔

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سر چشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**